CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

Sathsar ka
Suraj

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ستی سر کا سورج

خالد حسین

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جُملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

کتاب کا نام : ستی سر کا سورج

(SATI SAR KA SURAJ)

مصنف : خالد حُسین

سنِ اشاعت : 2011ء

تعداد : ایک ہزار

ترتیب و کمپوزنگ : وزیر محمد میر

سرورق : انتساب طاہر

پبلیشر : پنجاب ادبی سنگت، جموں

مطبوعہ : مکّہ پرنٹرز اینڈ پبلشرز، مالیر کوٹلہ (پنجاب)

فون: 01675-263289

ملنے کا پتہ : ذاکر پبلیکیشنز، بٹھنڈی جموں

موبائل : 09858000099، 09419183485، 0729800009

قیمت : -/250 روپے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

نسیم فردوس کے نام

جس نے اچھے بُرے وقتوں میں

ہمیشہ میرا ساتھ دیا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اِسی قلم سے

1. جہلم وگدار یہا	پنجابی افسانے
2. گوری فصل دے سوداگر	پنجابی افسانے
3. ڈونگے پانیاں داڈکھ	پنجابی افسانے
4. بلدی برف داسیک	پنجابی افسانے
5. ٹھنڈی کانگڑی کا دُھواں	اُردو افسانے
6. اشتہاروں والی حویلی	اُردو افسانے
7. گواچی جھانجھر دی چیک	تمل ناولٹ کا پنجابی ترجمہ
8. نوری رِشماں	غیر مُسلم بچوں کے لیے حضرت محمدؐ کی سوانح حیات پنجابی میں
9. خالد حُسین دا کتھا ساگر	پنجابی افسانوں سے متعلق تنقیدی مضامین کا مجموعہ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

فہرست

عنوان		صفحہ
پیش لفظ	پروفیسر قدّوس جاوید	8
کُچھ یادیں کُچھ باتیں	نورشاہ	35
ہم عصر ادیبوں کی آراء		42
ابنِ مریم ہوا کرے کوئی	خالد حسین	47

افسانے

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
5	ستی سر کا سورج	52
6	لکیر	63
7	پریم کھیلن کا چاؤ	81
8	ایک مرے بندے کی کہانی	87
9	آدمی کے اندر چُھپا آدمی	96
10	دیوار پر لکھے حرف	107
11	بھوک کو بھوجن کیا	109
12	حلالہ	113

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
13	دردِ چھوڑے کا حال	124
14	سانجھا درد	129
15	عروج و زوال کا المیہ	134
16	پسِ دیوار	143
17	بے گونج صدائیں	149
18	حرص کا سفر	154
19	گھر کی جنت	156
20	جمہوریت	162
21	کھنڈر ضمیر	166
22	شائننگ اِنڈیا	169
23	روپ اور سائے	174
24	لقے کبوتروں کا انت	182
25	ہاتھی اڑھائی لاکھ کا	184
26	عشق نچائے تھیا تھیا	192

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

پیش لفظ

ثقافتی تکثیریت کے زوال کا کرب

وہ شَے جسے افسانہ کہتے ہیں، وسیع معنوں میں صرف افسانہ نہیں ہوتا، زندگی اور زمین سے کشید کیا ہوا ایک ایسا تخلیقی سچ ہوتا ہے جسے افسانہ نگار کسی مخصوص معاشرہ اور ثقافت کے حوالے سے تمام تر فنی و جمالیاتی دروبست کے ساتھ ''جیتا'' ہے۔ اِس اعتبار سے خالد حسین کے اولین اُردو افسانوی مجموعہ ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھُواں'' اور دوسرے افسانوی مجموعہ ''اشتہاروں والی حویلی'' سے لے کر ''ستی سر کا سورج'' میں شامل افسانوں تک کی گہرائیوں میں اُتر کر دیکھیں تو خالد حسین کی افسانہ نگاری کے کئی امتیازات میں اولین امتیاز یہی گرفت میں آئے گا کہ خالد کے افسانے افسانہ کی ہیئت میں اپنے آس پاس کی زندگی اور زمین کی زندہ اور متحرک سچائیاں ہیں جن میں ماضی کے معاشرتی اور تہذیبی نظام کی روح بھی کارفرما ہے، حال کے اقداری انتشار کا کرب بھی اور ایک پُر امن اور اِنسان دوست مستقبل کی تعمیری تخیل بھی۔ خالد حسین نے ''اشتہاروں والی حویلی'' میں خود ہی لکھا ہے:

> ''۔۔۔سچا ادیب و فنکار نئے احساس اور نئی آواز کے ساتھ ادبی میدان میں اُترتا ہے۔ اِس کے لیے ادب کبھی نیا یا پُرانا نہیں ہوتا۔ ہاں! لوگوں کے مسائل ضرور نئے ہوتے ہیں جو وقت

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گزرنے اور سماجی و سیاسی قدریں بدلنے کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایک ادیب کا فرض ہے کہ وہ اپنی تخلیق کے ذریعے اِن مسائل کی نشاندہی کرے۔ زندگی کے سچ کو پیش کرے۔ ادب اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور سائنسی اثرات کا جائزہ لینے کا نام ہے۔ لوگوں کی بات کرنے کا نام ہے۔ مَیں نے بھی اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنے وقت کی بات کرنے کی کوشش کی ہے۔''

خالد حسین نے یہ باتیں 1991ء میں ''اشتہاروں والی حویلی'' میں ''مَیں اور میری تخلیق'' کے عنوان سے لکھی تھیں۔ ویسے خالد حسین نے 70-1969ء کے آس پاس سے لکھنا شروع کیا۔ یہ زمانہ اُردو میں جدیدیت کے رُجحان کے عروج کا زمانہ تھا۔ علامت نگاری اور تجریدیت کے حوالے سے افسانہ کے نام پر لایعنی الفاظ کی ایسی قے کی جا رہی تھی جس پر مکھیاں بھی نہیں بھنبھناتیں۔ افسانہ کی روایت، حتیٰ کہ پریم چند کی روایت کا بھی مذاق اُڑاتے ہوئے رشید امجد جیسے لوگ یہ اعلان کر رہے تھے کہ لفظ ''افسانویت'' بوڑھے نقادوں کا جمایا ہوا لفظ معلوم ہوتا ہے جس کے میرے نزدیک کوئی معنی نہیں''، لیکن افسانہ میں افسانہ پن نہ ہو تو کسی تحریر کو افسانہ کے منصب پر فائز کرنے کا جواز کیا ہو سکتا ہے۔ یہ بات نام نہاد جدیدیوں کی سمجھ میں بھی آ گئی اور تب رشید امجد نے بھی 91-1990ء میں ایک انٹرویو میں مانا کہ ''افسانہ میں چاہے وہ نیا ہو یا پُرانا، افسانہ پن کو بُنیادی حیثیت حاصل ہے۔''

خالد حسین کے افسانوی مجموعہ ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھُواں'' میں 1981ء تک کے افسانے ہیں اور دوسرے مجموعہ ''اشتہاروں والی حویلی'' میں 1990ء تک کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

افسانے شامل ہیں۔ یہ زمانہ اُردو میں جدیدیت کے رجحان کے زوال کا زمانہ ہے۔ خالد حسین نے اِس دَور میں جو افسانے لکھے ہیں اِن میں قدروں کی شکست وریخت اور عصری حِسیت کی گرفت کے علاوہ علامتی اور استعاراتی اسلوب کا برتاؤ تو ہے لیکن اِن کے افسانے، افسانہ کی نئی شعریات کے حوالے سے بھی بہر حال افسانے تو ہیں ہی۔ زندگی اور زمین کی سچائیوں کی تہوں اور طرفوں کو کھولنے والے بیانیہ اور خاص طور پر زبان کے انوکھے برتاؤ کے سبب افسانہ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ اِس ضمن میں خالد حسین کے افسانے ''اشتہاروں والی حویلی''، ''کنوار گندل''، ''بیڈے کی لنکا'' اور ''پسِ دیوار'' وغیرہ اہم ہیں۔ خالد حسین افسانہ کی ہیئت کو چھیڑنے پر یقین نہیں رکھتے لیکن اِن کے افسانوں میں واقعات کے تسلسل کے علاوہ خارجی زندگی کے تجربات اور داخلی جذبات واحساسات کو موضوع، مقصد یا نظریہ کو توازن وتناسب کے ساتھ ایسے ماہرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اِن کے افسانوں میں موجود افسانے کا اصل جوہر بغیر کسی ابہام یا اشکال کے قاری کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خالد کے افسانوں میں نام نہاد جدید افسانہ کی طرح لایعنیت، بے سمتی اور تقلیدی اجنبیت (Defamiliarisation) جیسے ہتھکنڈے استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ خالد حسین کے افسانے مرکز گریز (Centrifugal) نہیں بلکہ مرکز جو (Centripetal) ہیں۔ اِس لیے خالد حسین کی افسانہ نگاری کا ایک بڑا اہم امتیاز یہ ہے کہ موضوع چاہے جنسی نفسیاتی ہو یا سیاسی و اقتصادی، اِن کے افسانوں میں ہیئت پسندوں کے کلیے کے مطابق (Storynessof Story) لازمی طور پر ہوتی ہے اور اِس کی اصل وجہ یہ ہے کہ خالد حسین اپنے افسانوی کردار اور واقعات گھڑتے نہیں، اپنے سامنے اور آس پاس کی زندگی اور زمین سے منتخب کرتے ہیں۔ حسنہ کھوکھر (اشتہاروں والی حویلی)، جمن بابا (دِل کی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گلیاں)، گلاں (کنوار گندل)، بیڈا (بیڈے کی لنکا)، انسپکٹر رندھاوا (پانی کی لکیریں) وغیرہ کردار اِن کے اپنے محلّہ، ماحول، گلی اور گاؤں کے کردار ہیں۔ یہ سارے کردار اور اِن سے وابستہ واقعات تصوراتی نہیں حقیقی ہیں جنہیں خالد حسین نے ایک ذرا سا تخلیقی (Touch) دے کر فطری رنگ روپ میں قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ لیکن خالد حسین نے شروع میں بعض کہانیاں ایسی ضرور لکھی ہیں جن پر جدید افسانہ کی تجربہ پسندی کا اثر دِکھائی دیتا ہے۔ مثلاً ''اشتہاروں والی حویلی'' میں شامل افسانہ ''کھوکھلا سورج''۔ اِس افسانہ میں اُردو افسانہ کے مروجہ ہیئت و تکنیک کی نفی کا رُجحان ملتا ہے۔ افسانہ میں واقعات کا تسلسل افسانے کا بُنیادی فنی تقاضا ہے، لیکن اِس افسانہ ''کھوکھلا سورج'' کے آغاز میں ہی خالد حسین نے دعویٰ ٹھونک دیا ہے کہ:

> ''مَیں کہانی ٹکڑوں میں لکھنا پسند کرتا ہوں، کیونکہ مَیں پیوند کاری میں ماہر ہوں۔ یہ کہانی بھی مَیں ٹکڑوں میں ہی بیان کرنے جا رہا ہوں۔''

لیکن چونکہ خالد حسین بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ زندگی، زمین اور کہانی ٹکڑوں میں بٹ کر اپنی قدر و قیمت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اِس لیے دو جُملوں کے بعد ہی وہ سنبھل کر قارئین سے یہ بھی کہتے ہیں کہ:

> ''آپ میرا یقین کریں کہ یہ ٹکڑے خوبصورتی سے جُڑ جائیں گے اور کہانی بن جائے گی۔ ایک کہانی۔ کئی ٹکڑے، چھوٹے بڑے، غیر ضروری، ضروری ٹکڑے''۔

اور یہ سچ ہے کہ ٹکڑوں میں لکھے گئے بعض جدید افسانوں مثلاً ''پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ'' (بلراج مین را)، انٹرامورا سس (سریندر پرکاش)، تلقار مس (ظفر

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اوگانوی)، کی طرح خالد حسین کے اِس افسانہ ''کھوکھلا سورج'' میں انتشار اور بکھراؤ نہیں ہے۔ خیال کی اکائی افسانہ کے سبھی ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ دیتی ہے۔ دراصل جدیدیت کے زوال کے دِنوں میں اُردو افسانہ میں ایک تخلیقی رویہ یہ بھی اُبھرا تھا کہ افسانہ میں افسانویت (کہانی پن) پیدا کرنے کے لیے واقعات کے تسلسل سے زیادہ فکر و خیال کی اکائی ضروری ہے۔ یہ تخلیقی رویہ عالمی شُہرت یافتہ فِکشن نگار گبریل گاشیا مارکیز کے ناول (One Hundred Years of Solitude) اور اِن کے افسانوں کے اثر سے خاص طور پر ایشیا اور افریقہ کے نوآبادیاتی دباؤ (Colonial pressure) کے شکار رہے ممالک کے ادب میں زیادہ عام ہوا۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ اِس طرح کے افسانوں میں تجربیت (Experimentation) کتنی ہے اور افسانویت کتنی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ خالد حسین نے بھی اپنے تجرباتی اور علامتی افسانوں میں جوگندر پال، رتن سنگھ، غیاث احمد گدی، رام لعل، اقبال مجید، احمد یوسف اور سلام بن رزاق کی طرح ہی نہ تو کبھی توازن و تناسب کا دامن چھوڑا اور نہ افسانہ کی افسانویت کو تقلید و فیشن کی بھینٹ چڑھایا۔ اُن کے افسانہ ''پسِ دیوار'' کے اِس ساختیے پر غور کیجیے:

''ہر شخص دیواروں کا محتاج ہے۔ دیواریں، تعلقات کے بیچ کھڑی کرنے کے لیے۔ کمپلیکس کے سرابوں میں حفاظت سے اُڑان بھرنے کے لیے۔ دیواریں، مقصد پورا ہونے کے بعد مکارانہ فطرت کی تسکین کے لیے۔۔۔ یگوں میں پھیلے درد کے دریا کی لہروں کو شانت کرنے کے لیے۔ وہ ایک دیوار کا سہارا ڈھونڈنے لگی تا کہ وہ قلعہ بند ہو جائے اور ہزار ہا سروں والے اور بے شُمار ہتھیاروں سے لیس آسیب پل پل اِس کا پیچھا نہ کر سکیں۔ لیکن

CC-0. Sohail Kazml Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اُسے ہر بار کچی دیواروں سے ہی واسطہ پڑا جو مقصد پورا ہونے
کے بعد ہی گر جاتیں اور اِس کے نشیمن کے صحن میں پھر سے رستے
بننے لگتے۔ ایک پائیدار دیوار کی خواہش میں وہ آج بھی بھٹک رہی
ہے۔ تن کا صحرا لیے اور اِس صحرا کے لیے دِکھائی دینے والا ہر
نخلستان ایک سراب ہے۔۔۔"

1991ء کے بعد خالد حسین کے اُردو افسانوں کا نیا مجموعہ "ستی سر کا سورج" اب شائع ہو رہا ہے۔ بائیس افسانوں کا یہ مجموعہ خالد حسین کے فن افسانہ نگاری کی توسیع ہے۔ اِن کے لسانی، فکری اور افسانوی نظام کے اِنفراد و امتیاز کو مزید دھار اور رمق بخشنے والے اِن افسانوں میں خالد حسین نے خصوصیت کے ساتھ اپنی زمین ستی سر (جموں و کشمیر) پر چھائی ہوئی نفرت، وحشت، کٹر پن، تنگ نظری اور مکر و فریب کی تاریکیوں کی مختلف زاویوں سے تصویر کشی ہی نہیں کی ہے بلکہ ایک نئے سورج کے طلوع ہونے کا خواب بھی دیکھا ہے۔ تاکہ ستی سر میں پھیلی ہوئی تاریکی کا خاتمہ ہو سکے اور اِس زمین کے باسیوں کو عذاب کے دِنوں اور وحشت کی راتوں سے نجات مل سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ خالد حسین ریاست جموں و کشمیر کے ایک ایسے مُنفرد افسانہ نگار ہیں، جن کے لاشعور میں کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ اپنی تمام کروٹوں کے ساتھ محفوظ ہے اور شعور میں وہ تمام حادثات و سانحات زندہ و متحرک ہیں جو تقسیم مُلک کے دِنوں کے خون خرابہ اور ہجرت سے لے کر جہاد اور فساد تک نے اِس خطہ زمین پر پیدا کیے اور جنھیں خالد حسین نے افسانوں کے سانچوں میں انڈیل دیا ہے۔ خالد حسین نے "اشتہاروں والی حویلی" میں "مَیں اور میری تخلیق" کے حوالے سے 1991ء میں اپنے شعور میں پلتے ہوئے اِس کرب کا اظہار اِن الفاظ سے کیا ہے:

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''مَیں یکم اپریل 1945ء کو اُدھم پور میں پیدا ہوا۔ ابھی ماں کے دودھ کی بتیس دھاریں بھی پوری طرح نہیں پی تھیں کہ سیاست دانوں کی کرامات رنگ لائیں۔ مُلک تقسیم ہوا۔ ایک طوفان اُٹھا اور اِنسان کا لہو پانی بن گیا۔ اِنسانیت مرگئی۔ سیاست دانوں نے اپنے نجی مقاصد کی تکمیل کے لیے مذہبی جنون کو خوب اُبھارا۔ ہر طرف خون کی ہولی کھیلی اور اِس میں اُدھم پور کے ایک ''اِنسان'' ماسٹر غُلام حسین، چچا ماسٹر عبدالکریم اور عبدالقیوم، سب نفرت کی آندھی میں فنا ہو گئے اور ہنستا گھر اُجڑ گیا۔ سب کُچھ ختم ہو گیا لیکن زندگی کے دشوار گزار راستوں پر بھٹکنے کے لیے زندہ رہ گیا 'خالد حسین'۔''

خالد حسین کو اِس کرب سے کبھی نجات نہیں ملی بلکہ وقت گُزرنے کے ساتھ ساتھ خالد حسین کے اِس کرب پر اِس کی زمین، اِس کے ''ستی سر'' میں مذہبی جنون اور ''مَیں'' کے اہنکار، غرور و تکبر کی پنیریوں سے اُگنے والی طرح طرح کی بُرائیوں کی تہیں جمتی رہیں اور خالد حسین اِن تہوں کو ایک ایک کر کے اُدھیڑتے کھولتے رہے اور افسانوں میں ڈھالتے رہے۔ ''اشتہاروں والی حویلی'' کی اشاعت 1991ء میں ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب شیخ العالم نورالدین ولی کی زمین میں، ستی سر کی ثقافت اور عوامی مزاج کے برعکس، باغوں اور کھیتوں میں بارود بوئے گئے۔ گلی کوچوں میں لہو کے رنگ بکھیرے گئے۔ پاکیزگی اور تقدس کی روایات پامال کی گئیں اور بیٹیوں اور بہنوں کی عصمتوں پر ڈاکے ڈالنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ خالد حسین کے افسانوی مجموعہ ''ستی سر کا سورج'' میں شامل افسانے گُزشتہ بائیس برس میں ستی سر اور اِس کی سنتانوں پر چاہے انچاہے نازل

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہونے والے عذاب کے مختلف روپ ہیں۔ اور ہر روپ کے اندر سے ایک اِنسان دوست شخص اور فنکار خالد حسین کا پُرخلوص محبِ وطن، لیکن فکرمند چہرہ جھانکتا نظر آتا ہے۔ اِن افسانوں میں الگ الگ کرداروں کی شکل میں خالد حسین ہی حالات اور واقعات کی مار سہتا محسوس ہوتا ہے۔ خواہ وہ افسانہ ''لکیر'' کا سجاول چودھری ہو یا ''پریم کھیلن کا چاؤ'' کا مرزا ہمایوں بیگ، ''ایک مرے بندے کی کہانی'' کا منظور ہو یا ''آدمی کے اندر چھپا آدمی'' کا ضمیر احمد ہو یا تیج رام۔ خالد حسین نے یہ سارے کردار اپنے سامنے اور آس پاس کی زندگی میں الگ الگ جبلتوں، فطرتوں اور مزاج و اقدار کے ساتھ جینے والے ''اِنسانوں'' کو بہت قریب، بہت اندر سے پرکھ اور برت کر تخلیق کیے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر گھڑے نہیں ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ خالد حسین نے افسانہ کے فنی و جمالیاتی تقاضوں کے مطابق اپنی قوت تخیل اور مُنفرد لسانی نظام کی مدد سے اِن کرداروں میں نئی روح پھونک دی ہے۔ اِس لیے خالد حسین کے اکثر و بیشتر کردار اُردو افسانہ کے زندہ جاوید کرداروں مثلاً حامد، گھیسو اور مادھو (''عیدگاہ'' و ''کفن'' از پریم چند)، ''موذیل''، منگو کوچوان، کلونت کور اور ایشر سنگھ (''موذیل''، ''نیا قانون''، ''ٹھنڈا گوشت'' از سعادت حسن منٹو)، لاجونتی (''لاجونتی'' از راجندر سنگھ بیدی)، بتول (''کالی رات'' از عزیز احمد)، کالو بھنگی (''کالو بھنگی'' از کرشن چندر)، سردار جی (''سردار جی'' از خواجہ احمد عباس) کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ دراصل ابتدا سے ہی خالد حسین ایک جینوئن افسانہ نگار رہے ہیں۔ 1960ء کے بعد اُردو افسانہ میں نمایاں ہونے والی تقلیدی اور فیشن پرستانہ لہروں کے ساتھ بہتے چلے جانا خالد حسین کا شیوہ نہیں رہا ہے۔ جدیدیت کے عروج کے زمانے میں خالد حسین نے بھی متعدد افسانے علامتی، استعاراتی اور تمثیلی اسلوب میں لکھے لیکن اِس طرح کہ افسانہ کی افسانویت کو زک نہیں پہنچا بلکہ افسانہ کی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

معنوی تہہ داری اور گہرائی میں اضافہ ہی ہوا۔ اِس ضمن میں ''کھوکھلا سورج''، ''پسِ دیوار''، ''گھاس پر چلنا منع ہے'' وغیرہ افسانے اہم ہیں۔ اِس طرح کے افسانوں میں جدت پسندی، عصری حسیت اور قدروں کی شکست و ریخت کو اپنے زاویے سے برتا تو گیا ہے لیکن ایسے افسانوں میں خالد حسین نے دیگر فیشن پرست جدید افسانہ نگاروں کی طرح اپنے کرداروں کو بے چہرہ اور بے نام کر کے ''وہ'' یا ''مَیں'' کے قالب میں نہیں ڈھالا ہے اور یہ رویہ خالد حسین کی تخلیقیت میں خود اعتمادی اور افسانہ کی شعریات کے تئیں مستقل مزاجی کو ظاہر کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُردو، ہندی اور پنجابی ہی نہیں، دُنیا کی دیگر زبانوں کے عمدہ افسانوں میں بیانیہ اور کردار نگاری کو پوری توجہ اور توازن کے ساتھ برتنے کی مضبوط روایت ملتی ہے کیوں کہ کردار نگاری بیانیہ (Narration) کا مرکزی نُقطہ رہی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ افسانہ نگار کردار کے اندرون میں اُتر کر خار و خس یا لعل و گوہر کی دریافت کس حد تک کرتا ہے۔ جدیدیت کے امام شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی جدیدیت کے زوال اور مابعد جدیت کے آغاز کے دِنوں میں 1988ء میں اپنے مضمون ''افسانہ میں بیانیہ اور کردار کی کشمکش'' میں یہ مانا ہے کہ کردار نگاری بیانیہ کی قدیمی روایت کا حصہ ہے۔ بیانیہ کی قدیمی روایت اور جدید طریق کار میں بُنیادی فرق بدیعیات کا ہے گرامر کا نہیں''۔

چنانچہ خالد حسین کے افسانوں میں بیانیہ اور کردار میں کشمکش کے بجائے ایک ماہرانہ توازن و تناسب ملتا ہے۔ خالد حسین کے افسانوں میں بیانیہ بیانیات (Narratology) کی جدید ترین صورتوں میں بھی نظر آتا ہے۔ ماحول اور معاشرہ بعض خارجی اور داخلی تبدیلیوں کے باوجود وہی رہتے ہیں لیکن ڈسکورس بدلتا رہتا ہے۔ اقداری نظام (Value System) میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں لیکن خالد حسین اِس سارے ''بدلاؤ'' کے درمیان سے ہی کہانی کی ''کہت'' اور ''کہاوت''، ''کردار''

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اور ''کتھا'' کو گرفت میں لیتے ہیں۔ اِس لیے بدلتے بھاگتے وقت کے ساتھ خالد حسین کے بیانیہ میں بھی تبدیلی اور ارتقا کا آہستہ رد عمل تو ملتا ہے لیکن خالد حسین کا کمال یہی ہے کہ بدلاؤ کے اِس بہاؤ کے باوجود وہ ذات، زمین زندگی اور زمانہ کے اندر گہرائی تک کامیابی سے اُترتے ہیں اور پھر جو کُچھ نکال پاتے ہیں وہی خالد حسین کے افسانے میں ڈھل جاتا ہے۔ ''اشتہاروں والی حویلی'' کی طرح ''ستی سر کا سورج'' میں شامل زیادہ تر افسانوں کا تعلق ''ستی سر'' (ریاست جموں وکشمیر) کی زمین اور یہاں کے مختلف علاقوں کے عام اِنسان سے ہے اور صدیوں میں خصوصاً تقسیم مُلک کے بعد اور اِس سے بھی زیادہ 1990ء کے بعد جہاد، دہشت، ہلاکت اور ہجرت اور ہندو پاک تنازعہ کے حوالے سے ''ستی سر'' (ریاست) میں جو ایک مخصوص ذہنیت اور طرزِ حیات سامنے آئی ہے، اِس میں کافی کُچھ ایسا بھی ہے جس میں ہمارے قومی تشخص، سماجی شعور اور اِنسانی و اخلاقی روایات کی گہری نفسیاتی جڑیں موجود ہیں۔ خالد حسین نے اپنے افسانوں میں اِن مقدس جڑوں کی آبیاری کی ہے۔

''۔۔۔ ہم یہاں قُرآن اور شریعت کا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں اور تم اِس کافر کی طرف داری کر رہے ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔''

''شرم تو تم لوگوں کو آنی چاہیے۔ تم اِن کو کافر کہتے ہو، لیکن کیوں؟'' کافر تو وہ ہوتا ہے جو خُدا کی ہستی سے مُنکر ہو۔ مگر یہ لوگ تو اللہ کی ذات کو کئی شکلوں صورتوں میں مانتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کو پرماتما، ایشور اور اوم کے ناموں سے پُکارتے ہیں۔ ہماری طرح اِن کا بھی عقیدہ ہے کہ یہ دُنیا یا سرشٹی خُدا نے بنائی ہے اور اِسے چلانے والا صرف ایشور ہے۔ پھر یہ کافر کیسے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہوئے۔ تمہارے شِدّت پسند آقاؤں نے یا تم نے وید نہیں پڑھے۔ جو ہزاروں سال پُرانے ہیں اور جن میں اِنسانی عقل کو حیران کرنے والی باتیں درج ہیں۔ پھر ہمیں ایسی آزادی ہرگز قبول نہیں جس میں دوسرے مذاہب اور عقیدوں کے ماننے والوں کو اپنی مرضی کے مطابق جینے کا حق نہ ہو۔۔۔ اِتنی دلیری اور بے خوفی سے اپنی بات کہنے والے اور تیج رام کو بچانے کے لیے اپنی جان تک دینے والے شخص کو مَیں بڑی حیرانی سے دیکھے جا رہا تھا کیوں کہ یہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ ضمیر احمد تھا۔۔۔''

(افسانہ: ''آدمی کے اندر چُھپا آدمی'')

''سلوتری گاؤں کی مسجد سے اعلان ہو رہا تھا۔۔۔ بڑے دُکھ کے ساتھ سب کو اطلاع دی جاتی ہے کہ قاسم منہاس آج رات فوت ہو گیا۔ وہ اپنے گھر میں سویا ہوا تھا کہ سرحد پار سے ہونے والی فائرنگ میں ایک گولہ اُس کے مکان کے اندر گرا۔ گولہ پھٹنے سے قاسم منہاس موقع پر ہی دم توڑ گیا۔۔۔ سلوتری پونچھ، راولپنڈی سڑک پر ہمارا آخری گاؤں ہے۔ آجکل یہ سڑک فوجی چوکی پر ختم ہو جاتی ہے۔ گاؤں کے بالکل سامنے اور سرحد کی دوسری جانب تیتری نوٹ کا گاؤں ہے اور بیچ میں پونچھ دریا۔ اِس دریا کو آپ یہاں 'نو مین لینڈ' بھی کہہ سکتے ہیں۔ سرحد کے دونوں طرف فوجیوں کا گولہ باری کرنا روز کا معمول ہے۔ فائرنگ اور جوابی فائرنگ اپنی فوجی قوّت کا احساس دِلانے، جوانوں کو چاک و

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

چوبند رکھنے اور دشمن کو سبق سِکھانے کے لیے بہت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اِس فوجی طاقت کے مظاہرے میں نہتی زمین جُھلس جاتی ہے، پھر جھلسی ہوئی زمین سے موت اُگتی ہے۔ وحشت پھیلتی ہے۔ معصوم لوگوں کی جانیں تلف ہوتی ہیں۔ پر اتنی قیمت تو چُکانی ہی پڑتی ہے۔۔۔ سرحدوں کی حفاظت اور ملکوں کی سلامتی کے لیے۔۔۔''

(افسانہ: ''دردِ چھوڑے کا حال'')

خالد حسین اِس طرح کے افسانوں میں پریم چند اور بیدی کے ٹھیٹھ اور راست بیانیہ کو تراش کر افسانے کی بیانیات کو نئی جہات سے روشناس کرواتے ہیں۔ خالد حسین حقیقت نگاری سے تو کام لیتے ہیں لیکن اپنی سوچ، اپنے تخیل و تصوّر کی مدد سے حقیقت کے ظاہری پہلوؤں کو اُدھیڑ کر اُس کی باطنی حقیقت کو بھی گرفت میں لیتے ہیں اور اِسے کردار، واقعہ، مہاورات اور ضرب الامثال کے برمحل استعمال سے اِس طرح پیش کرتے ہیں کہ خالد کا بیانیہ ژاں ژینے (Jean Genat) کے مطابق کثیر الجہات بیانیہ (Hetrodiegtic Narrative) کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ مثلاً:

''جب سے نصیرا نیک حوروں کے ہاتھوں شراب طہور پینے بہشت میں چلا گیا تھا۔ تب سے جاجی کا چنچل من ''گلاں'' سنگ چنگ بجانا چاہتا تھا۔ اِس کے چرخے پر اپنا سُوت کاتنا چاہتا تھا۔۔۔''

(افسانہ: ''کنوار گندل'')

''جناب! دیش کیا آزاد ہوا، ہمارے لیے عذاب ہو گیا۔ ہم تیسرے درجے کے شہری بن گئے۔ ہماری حالت شُودروں سے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بھی بدتر ہوگئی۔ ہماری پہچان مُلک دُشمن، غدّار، جنُونی اور دہشت گرد بنا دی گئی ہے۔ ہمیں ہر میدان میں پچھاڑ دیا گیا ہے۔ ہم غُربت اور مسکینی کی بھٹی میں جل رہے ہیں۔۔۔ شیخ سعدی نے ٹھیک ہی فرمایا ہے کہ جس کے ہاتھ میں تیغ، اُسی کے ہاتھ دیگ اور یہ لوگ ہماری ہی دیگ میں ہمارے ہی لہو سے ہمارا ہی گوشت اُبالتے ہیں اور کُتوں کو کھِلاتے ہیں۔ ہماری تو دیش ماتا سوتیلی ہے اور باپ قصائی۔ یہاں برابری، غیر جانبداری اور آزادی کے نعرے کھوکھلے ہیں کیوں کہ سوراج اِن کا، راج اِن کا، تخت اور تاج اِن کا۔ ہمارا کیا ہے؟ ہمارے نہ گُھٹنے ہیں نہ ٹخنے۔ جبھی تو سبھی ہمیں بندھوا سمجھتے ہیں۔ ہم نہ سوئی کے قابل ہیں نہ سلائی کے۔''

(افسانہ: ''آدمی کے اندر چُھپا آدمی'')

''بابو جی! ہمیں سارا نظام بدلنا ہوگا۔ ہمیں ایک نیا انقلاب لانا ہوگا۔''

''پر انقلاب کے نعرے تو پہلے ہی گونجتے رہے ہیں۔ سماج واد کا راستہ تو پہلے بھی دِکھایا جاتا تھا مگر کیا انقلاب آیا؟''

''انقلاب بابو جی جبھی آئے گا جب عوام ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہوں گے۔ جب اِنسان کا ضمیر جاگے گا۔ ہمیں عوام کو تیار کرنا ہوگا۔ اِس نظام کے خلاف، کورپشن، بھائی بھتیجاواد، مذہبی جنون اور دہشت گردی کے خلاف، جس نے زندگی کو سخت پریشان بنا دیا ہے۔ ہمیں لوگوں کو اچھے اور بُرے کی تمیز سِکھانا ہو

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گی۔ آج سارے دیش میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔۔۔ ہمارا سیاسی نظام سودے بازی کی دین ہے۔ سودے بازی سرمایہ دار اور جمہوریت کا ڈھول پیٹنے والوں کے درمیان۔ سودا طے ہوتا ہے، غریب کا خون نچوڑنے کا۔ بابو جی! سرمایہ دار جمہوریت کے اَن داتا ہیں اور پرجاتنتر کو زندہ رکھنے والے دیوتے ہیں۔ یہ چناؤ کے خریدار ہیں۔ یہ پیسہ دیتے ہیں۔۔۔ سو گُنا سود پر۔۔۔ اور اُسے چندے کا نام دیا جاتا ہے۔ کچھ نوکریوں، کچھ سکول، کچھ ڈسپنسریاں، کچھ سڑکیں اور کچھ اور وعدے۔ اِس طرح الیکشن ختم اور جمہوریت زندہ باد۔۔۔''

(افسانہ: ''جمہوریت'')

لیکن خالد حسین کے بعض افسانے ایسے بھی ہیں جن میں جنسی نفسیات کی تہوں کو کھولنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''نازیہ کے تپتے بیسا کھ کو بوڑھا فنکار اپنی واسنا سے بھرے بن باس میں اُٹھا کر لے گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں، اپنی بانہوں میں چاند کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا پَر چاند اِس کی اُنگلیوں سے پھسل جاتا۔ بار بار پھسلن سے چاند نیچے گر گیا اور بوڑھے فن کار کی مُٹھی میں آ گیا۔ وہ بولا، ''وہ مکان جس کی چھت پر برف پڑی ہو اِس کے اندر بھی آگ جلتی ہے۔۔۔''

(افسانہ: ''پسِ دیوار'')

سہاگ رات کو صندلی رنگ کی راجاں صندل کی گہری خوشبو کی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

طرح نواب کے دِل میں اُتر گئی تھی۔ اُس کے گالوں پر بہاریں مُسکرا رہی تھیں۔ عنابی ہونٹوں پر مستی کی چکنائی تیر رہی تھی۔ گہری سیاہ زُلفیں جب پھنکارتے ہوئے سانپ کی طرح مخملی تکیے پر بکھریں تو نواب سے رہا نہ گیا۔ وہ اپنے بے قابو من کو گرم گرم سانسوں کی ٹکور دینے لگا لیکن دِل میں بھڑکتے ہوئے شُعلے جب آسمان چھونے لگے تو وہ جلتی ہوئی آگ کو گرم پانی سے بجھانے کے لیے راجاں کے ریشمی بدن کے ساتھ مخملی کمبل میں گھس گیا۔ نواب نے تو شاید اپنی آگ کو سرد کر لیا ہو لیکن ٹھنڈے یخ پانی سے نہانے کے باوجود بھی راجاں کے جسم کی آگ نہیں بجھی تھی۔۔۔ صبح جب راجاں نے کن انکھیوں سے نواب کو دیکھا تو اُس کا تن من بول اُٹھا کہ اِس مٹی کے پہلوان کی ٹانگیں ریت کی ہیں۔ اُس نے دِل ہی دِل میں نواب کو طعنہ دیا۔ ''بھری جوانی مانجھا ڈھیلا۔۔۔'' نواب اُس کے ساتھ میٹھا بولتا اور اُس پر موتی نچھاور کرتا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ عورت پہلے ''نر'' اور بعد میں ''زر'' مانگتی ہے۔۔۔''

(افسانہ: ''حلالہ'')

''ٹھنڈی کانگڑی کا دھُواں''، ''اشتہاراں والی حویلی'' اور ''ستی سر کا سورج'' میں شامل کئی اور افسانوں میں بھی خالد حسین نے جنس جیسے نازک لطیف اور بعضوں کے لیے متنازعہ موضوع کو بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگوں کو خالد کے اِس طرح کے جنسی افسانوں میں شہوانیت بھی نظر آئے لیکن اِس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کہ خالد حسین ایسے افسانہ نگار ہیں جو سیاست، سماجیات، اخلاقیات اور تہذیب و ثقافت سے لے کر مذہبیات تک کے کسی بھی موضوع کے بارے میں ''سچ'' بولنے کا مادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ اِن کے افسانوں میں اپنے جیتے جاگتے ماحول اور کرداروں کے جنسی حقائق و مسائل کے بارے میں اظہارِ خیال بھی اُن کی اِسی حق گوئی کا حصّہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خالد حسین کی جنس نگاری میں وہ ہوسنا کی اور سفلہ پن نہیں جو مغربی تہذیب کا خاصہ ہے۔ ویسے خالد حسین جس مُلک کے شہری ہیں، وہاں کے اساطیر میں ''جنس'' کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں ''یونی'' اور ''لنگم'' کی پوجا صدیوں سے ہو رہی ہے۔ ہندوستانی مصوّری، سنگ تراشی اور رقص و موسیقی میں جنس کا عمل دخل دُنیا کی کسی بھی تہذیب سے کہیں زیادہ رہا ہے۔ ہندوستانی فکشن میں کتھا سرت ساگر، ہت اُپدیش سے لے کر مہا کاویوں، داستانوں اور مثنویوں تک کے ہزاروں قصوں کہانیوں میں جنس کا وہ کون سا پہلو ہے جسے بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اُردو افسانہ کی بات کریں تو منٹو (ٹھنڈا گوشت، ہتک)، بیدی (میتھن، لمبی لڑکی)، عصمت (لحاف دو ہاتھ) وغیرہ کے بعض افسانے کس درجہ شور انگیز جنسی افسانے رہے ہیں اِس سے ہر شخص واقف ہے لیکن منٹو اور بیدی کی طرح خالد حسین کے یہاں بھی جنس کا بیان چٹخارے لینے کے لیے نہیں بلکہ اپنے عہد کے دوغلے نظام کی خامیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے ہوا ہے۔ منٹو نے اپنے ایسے افسانوں پر اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا:

> ''اگر آپ اِن افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔ جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے''۔

خالد حسین نے اپنے افسانوں میں منٹو کی طرح اپنے انداز میں زندگی کو پوری

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سچائی کے ساتھ جیا ہے۔ ''اشتہاروں والی حویلی'' میں شامل افسانہ ''سورج کا گیت'' میں خالد حسین نے اپنے ایک کردار کی زبان میں منٹو سے اپنی مماثلت کا اظہار اِن الفاظ میں کیا ہے:

> ''میری طرح منٹو بھی زندگی کی حقیقتیں لکھتا لکھتا بٹوت کے سینی ٹوریم میں جا پہنچا وہاں اُسے ''بیگو''، ''مصری کی ڈلی'' بن کر ملی۔ زندگی کی ایک اور سچائی۔ یہ ترقی پسندی کے علمبردار کتنی دور جا پہنچے ہیں لیکن پیچھے رہ گئے سعادت حسن منٹو اور پرویز ہاشمی جن کے حصے میں صرف جیون کے کڑوے سچ آئے یا مینگو سگریٹ اور شراب جو تیزاب بن کر دونوں کو پھونک گئی۔۔۔''

(افسانہ: ''سورج کا گیت'')

خالد حسین بُنیادی طور پر پنجابی کے افسانہ نگار ہیں اور اس حوالہ سے برِصغیر ہندو پاک کے پنجابی ادبی حلقوں میں اپنا مُنفرد مقام رکھتے ہیں۔ اُن کے پنجابی افسانے یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل رہے ہیں۔ پنجابی میں اُن کے چار افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ برِصغیر کے نامور پنجابی نقادوں نے بھی اُن کے افسانوں پر مضامین لکھے ہیں جو مختلف جرائد میں چھپے ہیں اور کتابی صورت میں بھی ''خالد حسین دا کتھا ساگر'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ پنجابی میں اِن کی اور بھی تصنیفات ہیں جن کا ذکر یہاں ضروری نہیں۔ اُردو میں بھی خالد حسین بحیثیت افسانہ نگار اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ خالد حسین نے اپنے افسانوں میں واقعہ، کردار، مرکزی خیال اور عصری زندگی اور زمانے کا تفصیل کے ساتھ تجزیہ و تبصرہ بھی پیش کیا ہے۔ زندگی کے انتشار، زمانے کے بحران اور اُن سب کے درمیان پستے ہوئے اِنسانوں کی تلخ و شیریں سچائیاں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بیان کی ہیں۔ کبھی ثقافت، کبھی معاشرت، کبھی مذہبیت تو کبھی جنسیت اور سیاست کے انسلاکات کے ساتھ اور خاص بات یہ ہے کہ خالد حسین موضوع، واقعہ، کردار اور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اپنا اسلوب بدلنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ یوں اُردو افسانے میں اسلوبیاتی اعتبار سے پانچ روایتیں نمایاں ہیں۔ پریم چند کی، کرشن چندر کی، منٹو کی، بیدی کی اور انتظار حسین کی۔ خالد حسین کا اسلوب اِن پانچوں اسلوبیاتی روایات سے آگے کا سفر ہے۔ خالد حُسین نے منفرد تراکیب ومحاورات اور نادر استعارات وعلامات کے لسانی برتاو سے ادائے مطلب کی نئی راہیں ہموار کی ہیں۔ ترکیب سازی شاعری کے بُنیادی تخلیقی حربوں میں سے ایک ہے۔ غالب کی بوطیقا کا زیادہ تر دارومدار اِن کی نادر و نایاب ترکیبات پر ہی ہے۔ خالد حسین غالباً واحد ایسے فنکار ہیں جنھوں نے اپنی مُنفرد لیکن زمین سے گہرا رشتہ رکھنے والی ترکیبات کو برت کر افسانہ میں معنی آفرینی کی ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ خالد حسین کی اِن چند ایک ترکیبات پر غور کیجئے:

''کرم گیان کا چرخہ؛ محبت گھاس کے جنگل؛ چُپ کا سناٹا؛ رحمت کا دریا؛ امیری اور غروری؛ اہنکار کی کٹار؛ کٹرواد کی پنیری؛ فقیری کی صبوری؛ نصیب کی پٹاری؛ غُربت کا سانپ؛ جھوٹ کو پھٹکار سچ کو ستکار؛ عزت کی دستار؛ دُکھوں کی ناؤ؛ کرموں کی روٹی؛ معرفت کی چٹائی'' وغیرہ۔

اِس طرح کی عام فہم ترکیبات ومحاورات سے خالد حسین کی سوچ اور فکر کی سمتوں کا تو پتہ چلتا ہی ہے اِن کے افسانوں کا بیانیہ بھی چشم دید بیانیہ (Figural Narration) کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ کردار کا اندرون قاری پر منکشف ہو جاتا ہے اور بحیثیت مجموعی افسانے میں وہ بات پیدا ہو جاتی ہے جو افسانے کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے اور اگر خالد حسین کے افسانوں میں آنے والے محاورات اور ضرب

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

الامثال کو بھی شامل کر لیا جائے تو پھر یہ ماننا ہوگا کہ خالد حسین نے اُردو افسانہ میں اسلوبیات کی ایک نئی روایت قائم کی ہے۔

اِس مقام پر پہنچ کر میں یاد دلانا چاہوں گا کہ میں نے ابھی تک خالد حسین کے افسانے ''ستی سر کا سورج'' پر گفتگو نہیں کی ہے۔ یہ افسانہ ہی خالد حسین کے اس تازہ ترین افسانوی مجموعے کا سرنامہ یا عنوان ہے۔ ساتھ ہی یہ افسانہ کئی جہتوں سے خالد حسین کے فکر و فن کی معراج کا بھی حکم رکھتا ہے۔ خالد حسین نے اِس افسانہ میں ریاست جموں و کشمیر کے ناگفتہ بہہ اور تشویشناک ''حال'' (Present) کا رشتہ اس کے ہزاروں سال پر محیط تاریخ سے جوڑ کر اپنی زمین، اپنی قوم کے تلخ حقائق اور مسائل کا بڑے ہی جرأت مندانہ انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ خالد حسین نے نور الدین ولی (نند رشی) للیشوری، سلر سین، کشپ پیر اور حضرت حمزہ مخدوم جیسے کرداروں اور جہاد اور فساد کے زائیدہ خون آشام واقعات کی بنیاد پر اِس افسانے کو قائم کیا ہے۔ اساطیری اسلوب میں خالد حسین نے ''مَیں''، اہم، اہنکار حاکم اور اقتدار کی پیدا کردہ صورتِ حال کی تصویر کشی کرتے ہوئے اِن تمام دردناک اور شرمناک سچائیوں کو بے نقاب کیا ہے جن سے آج ''ستی سر'' کے مرد و زن دوچار ہیں۔ ''ستی سر کا سورج'' اِس حقیقت کا غماز ہے کہ افسانہ نگار خالد حسین کا بُنیادی تخلیقی تجربہ اپنی زمین ''ستی سر'' (جموں و کشمیر) کی مشترکہ تہذیب (Composit Culture) کے بکھراؤ کا تجربہ ہے۔ اِس تجربہ نے خالد حسین کے فکر و فن میں سیاست، حکومت اور قیادت کے تئیں یاسیت اور احتجاج کے جو جذبات پیدا کیے ہیں وہی اِس افسانہ بلکہ خالد کے پورے فن کے محرک ہیں۔ خالد حسین واضح طور پر اپنی زمین میں اِس خوش آئندہ تبدیلی کی خواہش رکھتے ہیں۔ ایسی تبدیلی جس سے ''ستی سر'' میں ایک بار پھر اُسی پُر امن، اِنسان دوست تہذیب و ثقافت کا احیا ہو سکے جس تہذیب

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

وثقافت کو یہاں صوفیوں اور سنتوں نے اپنی صدیوں کی ریاضت سے پروان چڑھایا تھا۔ خالد حسین کی یہی خواہش اُنہیں چودھویں صدی کی ایک ایسی روحانی شخصیت کے قریب لے جاتی ہے جس نے گنگا جل اور زم زم کو آپس میں شیر وشکر کر کے اِس سرزمین پر ایک مثالی ثقافت کی تشکیل کی تھی۔ اِس شخصیت کا تعارف خالد حسین اِس طرح کرواتے ہیں:

''اُس کا نام نُور تھا۔ وہ محبت اور معرفت کی چٹائی پر بیٹھ کر لوگوں کے دِلوں کو اپنی نُوری کرنوں سے روشنی بخشتا تھا۔۔۔ وہ بندہ رب کا تھا اور خادم سب کا تھا۔ وہ کامل صوفی درویش تھا جو مسجد میں بیٹھ کر شنکھ بجاتا اور مندر میں بیٹھ کر نماز گزارتا۔ وہ اپنی ماں للیشوری کی گود میں بیٹھ کر معرفت کی کھیلیں کھیلتا رہتا۔ دونوں نے مل کر اپنے واکھوں اور شلوکوں سے امن، شانتی، ایکتا اور دوستی کی جوت جگائی تھی۔ وہ لوگوں کے دِلوں پر راج کرتا تھا اور لوگ اُسے پیار سے نُندرشی کہتے تھے کیوں کہ وہ رانجھا سب کا سانجھا تھا۔۔۔''

(افسانہ: ''ستی سر کا سورج'')

خالد حسین نے اِسی نندرشی کو ''سورج'' کی علامت کے طور پر برتا ہے اور پھر ''ستی سر'' کے عبرتناک حالات کا تمثیلی انداز میں نقشہ کھنچا ہے اور بتایا ہے کہ اَنا کے شکار حُکمرانوں، جنونی مُلاؤں اور ادھرمی دھرماتماؤں نے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر کے ''ستی سر'' کی مثالی اِنسان دوست ثقافت کی دھجیاں اُڑا دی ہیں۔ ''ستی سر'' کی تہذیب وثقافت کے زوال کا کرب خالد حسین کے اِس افسانے میں پوری شدّت کے ساتھ بڑے ہی جذباتی، لیکن سچے انداز میں سامنے آیا ہے:

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''دھرم اور راج نیتی نے دِلوں میں نفرت کا زہر بھر دیا۔ فقیری اور درویشی دم توڑنے لگی۔ سادھ اور سنتوں کے تکیے اُجڑنے لگے۔ لوگ ''اللہ ایشور تیرو نام'' کو چھوڑ کر بارُود کی پوجا کرنے لگے۔ وید، گرنتھ، پُران اور سامی کتابیں دفن کر دی گئیں۔ نئے گرنتھ لکھے جانے لگے۔ جہاد اور فساد کا فلسفہ پروان چڑھنے لگا۔ گھروں، سڑکوں اور کھیتوں میں بم بیجے گئے۔ مکر اور فریب کی دُکانیں مندروں اور مسجدوں میں سجائی گئیں۔۔۔ وقت ایسا آیا کہ بھائی بھائی سے ڈرنے لگا۔۔۔ شک اور نفرت نے بھائیوں میں لکیر کھینچ دی۔ سچ اور محبت کی دولت، دھرم اور سیاست کے مرتبانوں میں قید کر دی گئی۔ پھر عزت اور شرافت کی دستار مٹی میں مل گئی۔ عورتیں چوراہوں پر ننگی کی گئیں۔ پھر لوگوں نے غُنڈوں کی سرداری دیکھی۔ شریفوں کی لاچاری دیکھی۔ علموں اور عقلوں والے گھاس کے بھاؤ تولے گئے۔ خلقت کی تباہی کچھ ڈر اور خوف نے کی اور کچھ کلاشنکوف نے کی۔ دھرتی بانجھ ہوگئی۔ وحشی جانوروں نے عورت کی کوکھ کو مالِ غنیمت سمجھا۔ بچے دانیاں لہولہان ہو گئیں۔۔۔ بارود نے زندگی اور موت کے درمیان کا فاصلہ مٹا دیا۔ بدکاری اور بدچلنی عام ہوگئی۔ بے حیائی سڑکوں پر ناچنے لگی۔ لوگ گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اُن گھروں کو، جہاں اُن کا ماضی رہتا تھا۔۔۔ اُنھوں نے پرائی دھرتی پر ڈیرے جما لیے۔ اُن کی پہچان پرائی تہذیب میں گم ہونے لگی۔۔۔ پاپی صرف پاپ کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہوئے نہ مائی کے نہ باپ کے ہوئے۔ گھروں میں روز ماتمی
چٹائیاں بچھنے لگیں۔ بارُود کے کھیل میں مکان جلے۔ مندر، مسجد
اور خانقاہیں جلیں۔۔۔ اور ایک دِن اِس بارُود کے کھیل میں نُند
رشی کا مزار بھی جل گیا۔ اُس کا آباد چرار بھی جل گیا۔۔۔''

(افسانہ: ''ستی سر کا سورج'')

مذکورہ بالا اقتباس کے دوٹوک (Surrealistic) فِقرے صرف ''ستی سر'' کے سماجی و ثقافتی بحران کی عبرتناک تصویریں ہی سامنے نہیں لاتے بلکہ اِن فِقروں سے آہوں اور سسکیوں کی آوازیں بھی آتی ہیں اور روح اور ضمیر میں لگے زخموں کی ٹیسیں بھی اُبھرتی ہیں۔ یہ اقتباس محض افسانے کا ایک ساختیہ نہیں ''ستی سر'' کی مقتول ثقافت کا نوحہ بھی ہے۔ اِن سطور کے معنی، مفہوم اور کیفیت کی چاہے جتنی بھی تعبیریں کی جائیں کم ہوں گی، کیوں کہ بین السطور درد و غم کی ان گنت لہریں ہیں، جو ''ستی سر'' کے اِس سیاسی، سماجی اور ثقافتی (Trauma) کے بطن سے پھوٹی ہیں اور جس کی جڑیں قیامِ پاکستان، فسادات، ہجرت اور منافقانہ سیاست تک پھیلی ہوئی ہیں۔ خالد حسین کے اِس افسانہ میں اور دیگر متعدد افسانوں میں کشمیری قوم کے اِس (Diaspora) یا قومی تشخص کی شکستگی کے مہیب سائے رقصاں ہیں۔ منٹو کے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' بیدی کے ''لاجونتی'' اور قرۃ العین حیدر کے ''چاندنی بیگم'' کی طرح خالد حسین نے ''ستی سر کا سورج'' میں بھی آدمی کے اندر مُردہ ہو چکے آدمی کو اُس کی تہذیبی و ثقافتی روایات کے حوالے سے جگانے کی کوشش کی ہے۔ اِس افسانے میں خالد حسین نے وضاحتی انداز میں حقائق اور مسائل کے بیان کے بعد اپنی ثقافت کے اجزائے ترکیبی کی شیرازہ بندی کرنے اور اپنی قوم کی تہذیبی اِنفرادیت کو از سرِ نو وقار بخشنے کے لیے تصوراتی طور پر تمثیلی اسلوب میں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

مرگن (پیر پنچال) کے میدان میں رشی مُنیوں کی مجلس منعقد کروائی ہے جہاں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ لوگوں کو طاقت کی سرداری اور دہشت کی بیماری سے آزاد کروایا جائے۔ پوری ثابت قدمی اور بے خوفی کے ساتھ اپنی تہذیب و ثقافت کی کشتی کو ڈوبنے سے بچایا جائے۔ ''مَیں'' کا سر کاٹ دیا جائے اور نجات کے رتھ پر سوار ہو کر دِلوں کی دھڑکنوں کو سکون بخشا جائے تا کہ اِنسانیت کی بیلیں ہری رہیں اور اِس لڑائی کی سربراہی ''ستی سر کا سورج'' نندرشی ہی کر سکتا ہے لیکن نندرشی کہاں ہے..... کہاں نہیں ہے؟ ''ستی سر کا سورج'' کی کرنیں تو ہر جگہ بکھری پڑی ہیں۔ ضرورت صرف من کی آنکھیں کھولنے کی ہے۔ خالد حسین نے افسانہ کے آخر میں ایک بار پھر اپنی تہذیب اور ثقافت کی بازیافت پر زور دیتے ہوئے نندرشی کی زبان میں کہا ہے کہ:

> ''تم لوگ اپنی تہذیب اور ثقافت کو بھول چکے تھے، تم نے حسد اور بُغض کا میلا چولا پہن لیا تھا، لیکن اب تمہارے دِلوں اور دماغوں سے اِن جنونی پاکھنڈیوں کے جادو کا نشہ اُتر چُکا ہے۔ تم لوگوں نے اب بہت مصیبتیں سہہ لی ہیں لہٰذا چلو آگے بڑھو ''مَیں'' کے خلاف ایک جُٹ ہو کر لڑائی لڑو۔ ''ستی سر'' کو جنون، نفرت، پاکھنڈ اور گھمنڈ کی لعنت سے آزاد کراؤ۔ اپنی تہذیب، اپنی ثقافت کو بچاؤ۔ اپنی روایات کو زندہ رکھنے کے لیے بدی کو فنا کر دو''۔

(افسانہ: ''ستی سر کا سورج'')

اِسے خالد حسین کا کمال فن ہی کہیں گے کہ اُنھوں نے اِس افسانے میں اپنے اور ''ستی سر'' کے باسیوں کے شعور و لاشعور، حال و ماضی، حقائق اور مسائل، تجربات اور مشاہدات اور نظریات کو ایک تخلیقی نُقطہ ''سورج'' (نندرشی) پر مرتکز کر کے افسانے کو حد

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

درجہ با مقصد اور معنی خیز بنا دیا ہے۔ خالد حسین یہ مانتے ہیں کہ ''ستی سر'' کی کسی بھی طرح کی آزادی سے پہلے ہر طرح کے جنون، نفرت، انہکار اور بغض و حسد سے آزادی ضروری ہے تا کہ اپنی تہذیب اور ثقافت کی روایات اور قومی تشخص کو زندہ رکھا جائے لیکن ساتھ ہی خالد حسین سرکاروں اور سرداروں کو یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ ''ستی سر'' میں جہاد اور فساد، کلاشنکوف اور کرفیو کے حوالے سے جو صورت حال سامنے آئی ہے اُس کی جڑیں ''ستی سر'' کے بیجوں بیچ کھینچی گئی ''لکیر'' میں بھی پیوست ہیں۔ یہ لکیر آزادی اور تقسیم ملک کے نام پر کشمیری عوام کی رائے جانے بغیر کھینچی گئی تھی اور نامحسوس طور پر کشمیری قوم اجتماعی اور انفرادی، ہر اعتبار سے ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے۔ اِس لکیر نے 1947ء کے بعد آنے والی نسلوں سے اُن کی تہذیب و ثقافت ہی نہیں، ہزاروں سال کی تاریخ، روایات اور مزاج میں بھی دراڑیں اور ناہمواریاں پیدا کر دی ہیں۔ یہ لکیر ہجرت، علیحدگی، نفرت، عداوت، حسرت اور یاسیت کی علامت بن گئی ہے۔ خالد حسین نے اِس تناظر میں ستی سر کے عوام کے اجتماعی تاریخی تجربہ اور کرب کو اپنے افسانہ ''لکیر'' میں سجاول چودھری اور صابری کے حوالے سے ایک ''کڑوے سچ'' کی طرح بے نقاب کیا ہے۔ افسانہ لکیر میں بھوٹ بھائیاں کے سجاول چودھری اور صابری، حسب و نسب، جبر و قید اور دہشت و وحشت سے بھاگ کر راجوری میں پیار کے ستونوں پر ایثار کی چھت ڈال کر محبت کا ایک آشیانہ بنا لیتے ہیں۔ وقت گزرتا ہے۔ آنگن میں سانول اور نفیسہ پروان چڑھ رہے ہیں۔ سجاول اپنی محنت سے ترقی کر رہا ہے لیکن اِسی دوران صابری اپنے والد چودھری سراج دین کی وفات کی خبر سُن کر چاچا سردار اُتم سنگھ کے ساتھ اپنی ماں سے ملنے کی غرض سے بھوٹ بھائیاں جاتی ہے، یہ وعدہ کر کے کہ وہ جلد ہی واپس آجائے گی لیکن صابری کے جانے کے کچھ دِنوں بعد ہی مُلک تقسیم ہو گیا۔ کُشت و خون

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کی آندھی چلی۔ قبائلی حملہ ہوا۔ بھارتی فوجیں ریاست میں داخل ہوئیں، قبائلیوں کو ریاست سے کھدیڑنے کے لیے اور نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت کے ساتھ ریاست جموں وکشمیر بھی تقسیم ہوگئی۔ صابری بھوٹ بھائیاں (پاکستان) میں رہ گئی اور اُس کا سجاول راجوری (ہندوستان) میں۔ سجاول پوتے پوتیوں والا ہوگیا، لیکن اُسے پتہ نہیں تھا کہ اِس کی صابری کہاں ہے، زندہ ہے یا مرگئی ہے۔ سجاول چاہتا تھا کہ مرنے سے پہلے ایک بار صابری کو دیکھ لے۔ سجاول نے افسانہ کے راوی خالد حسین سے صابری کی کھوج خبر کی التجا کی۔ راوی کو سرینگر سے مظفر آباد جانے والی پہلی بس سے پاکستان جانا تھا۔ راوی سجاول کی درد بھری کہانی سُن کر جذباتی ہوجاتا ہے اور سوچتا ہے کہ ''مُلک کی تقسیم کی وجہ سے لاکھوں خاندان اُجڑے، لاکھوں موت کا نوالہ بنے۔'' وہ من ہی من میں سیاست دانوں اور مذہبی جنونیوں کو کوستا رہا لیکن راوی نے سجاول سے کیا ہوا وعدہ نبھایا۔ بھوٹ بھائیاں جا کر صابری سے ملا اور اُسے اُس کے سجاول، سانول اور نفیسہ کے بارے میں سب کچھ بتایا۔ صابری نے روتے بلکتے سب کچھ سُنا اور پھر صابری اماں نے اپنی دُکھ بھری کہانی سُنائی کہ تقسیم کے دِنوں میں کِس طرح اِنسان ہندو اور مُسلمان کے نام پر مارے جارہے تھے لیکن کشمیر کی مشترکہ تہذیب کے پروردہ چاچا سردار اُتم سنگھ کو سجاول سے کیا اپنا وعدہ یاد تھا۔ سردار چاچا اِسی دنگے فساد کے ماحول میں صابری کو سجاول کے گھر پہنچانے کے اِرادے سے نکلا:

> ''ہم مدار پور کے راستے بلنوئی پہنچے۔ وہاں رات گُزاری۔ دوسرے دِن سورج نکلنے سے پہلے ہم وہاں سے چل پڑے۔ ابھی مینڈھر کے نزدیک سنی میدان ہی پہنچے تھے کہ پٹھان بلوائیوں نے ہمیں گھر لیا۔ ایک بلوائی جب میری طرف بڑھنے لگا تو چاچے اُتم

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سنگھ نے اُنھیں للکارا اور تلوار نکال لی۔ مگر بلوائیوں کے پاس
بندوقیں تھیں۔ چاچے نے بڑی دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن
تلوار بندوق کا مقابلہ نہ کرسکی۔ چاچا اُتم سنگھ شہید ہوگیا۔ میری
لاج بچاتے بچاتے اور اپنا وچن نبھاتے نبھاتے۔۔۔''

(افسانہ: ''لکیر'')

مشترکہ تہذیب کے پیکر خالد حسین نے امّاں صابری کے راجوری آنے کا بندوبست کروایا اور آخر کار امّاں صابری ''چکاں دے باغ'' والے راستے سے اپنے سجاول اور اپنے بچوں سانول اور نفیسہ کے پاس پہنچ گئی۔ اُسے اپنے ہی وطن میں اجنبی کی طرح صرف ایک ماہ رہنے کی اجازت ملی تھی جو پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ امّاں صابری کو راجوری میں مستقل رہائش کی اجازت نہیں ملی۔ آخر کار امّاں صابری کو پاکستان جانے کے لیے نکلنا پڑا۔ ''چکاں دے باغ'' کی ہند پاک سرحد پر ''نو مین لینڈ'' کے مقام پر پہنچ کر:

''اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ گر پڑی۔ اُس کو اُٹھانے کے
لیے دونوں ملکوں کے سرحدی محافظ دوڑے پر جب وہ امّاں
صابری کے پاس پہنچے تو اُنھوں نے دیکھا کہ امّاں صابری کی
روح جسم کا پنجر چھوڑ چکی تھی اور سارے قاعدے، قانون اور
ضابطوں سے آزاد ہو چکی تھی۔۔۔''

(افسانہ: ''لکیر'')

اِس افسانہ میں بالائی سطح پر بھی اور اِس کی تاثراتی زیریں لہروں (Under Currents) میں بھی خالد حسین بار بار اپنے اِس نُقطۂ نظر کو دُہراتے نظر آتے ہیں کہ تقسیم

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

مُلک ایک ایسا سانحہ تھا جس نے نہ صرف کشمیر بلکہ پورے برِصغیر کی تہذیب وثقافت کو تار تار کر دیا۔ ہندو مُسلم منافرت کی بُنیاد اُنھیں دِنوں پڑی تھی۔ اِنسانیت پر خود غرضانہ سیاست اور جنونی مذہبیت اُنھیں دِنوں حاوی ہوگئی تھی۔ ''ستی سر'' میں آٹھویں نویں دہائی میں ظہور میں آنے والی ''دہشت گردی'' بھی اِسی تقسیم کے بیج کا پودا ہے۔

خالد حسین نے اپنے ایک اور افسانہ ''آدمی کے اندر چھُپا آدمی'' میں اِس دہشت گردی کے بالمقابل اِنسانیت کو کھڑا کیا ہے لیکن اِس سچائی کے ساتھ کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں مُسلمانوں کے ساتھ مُنصفانہ سلوک نہیں ہوا۔ اِس افسانے کا مرکزی کردار ضمیر احمد ایک حسّاس مسلمان ہے۔ وہ ہندو دُشمن نہیں لیکن بڑھتے ہوئے ''ہندُتو واد'' کا مخالف اور سیاسی اور سماجی نابرابری اور جانبداری کی سرکاری پُشت پناہی سے بیزار بھی ہے۔ اِسی طرح وہ کٹر وادی مولویت کے بھی خلاف ہے۔ ضمیر احمد کو راوی سمجھاتا ہے کہ ''تنگ نظری، انتہا پسندی اور جنونیت دونوں طرف ہے۔ سبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ آدمی آدمی میں انتر ہوتا ہے''۔ ضمیر احمد مُلک کی تقسیم کو ہندوستانی مُسلمانوں کے لیے ہلاکت خیز مانتا ہے کیونکہ تقسیم مُلک کے بعد مُسلمان تیسرے درجے کا شہری بن کر رہ گیا ہے۔ اِس کے ذہن میں آزادی کے دِنوں کے فسادات اور اِس کے بعد کے حالات بھی ہیں لیکن ضمیر احمد کا ضمیر بیدار بھی ہے، روشن خیال بھی اور اِنسان دوست بھی۔ اِس لیے وہ مذہبی جنون کا مخالف ہے اور اِسی بنا پر وہ جنونی دہشت گردوں کے عتاب سے اپنے ڈرائیور تیج رام کو بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتا ہے اور یہی کشمیر کی ثقافت کا امتیاز ہے اور خالد حسین کے افسانوں میں اِسی تہذیبی تکثیریت (Cultural Pluralism) کے مختلف زاویوں کی ترجمانی الگ الگ ڈھنگ سے ہوئی ہے تاکہ لوگوں کو یہ احساس ہو سکے کہ قومی تشخص کو اُس کے تمام تر امتیازات کے ساتھ زندہ اور متحرک رکھنا ضروری

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہے۔ ویسے بھی 1910ء کے نوبل انعام یافتہ فکشن نگار ماریو ورگاس لوسا اور افریکی ناول نگار چینوا ایشبے وغیرہ کے حوالے سے یہ دَورِ فکشن میں بڑی مرکزی تہذیبوں کی بجائے چھوٹی تہذیبوں (Subalturn Culture) سے سروکار رکھنا اِنسان اور اِنسانیت کے تحفظ کے لیے لازمی تصور کیا جاتا ہے۔ اُردو میں خالد حسین واحد افسانہ نگار ہیں جو تواتر کے ساتھ اپنی زمین اپنے ستی سر سے جُڑی سماجی، سیاسی اور ثقافتی سچائیوں کو منفرد زبان، موزوں بیانیہ، جیتے جاگتے کردار اور موضوعاتی، فنی اور جمالیاتی سروکاروں کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کر رہے ہیں۔

خالد حسین کے افسانوں کے بیانیہ میں حِکمت ہے اور اسلوب میں جادو۔ اِسی لیے خالد حسین کے سابقہ افسانوی مجموعوں ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' اور ''اشتہاروں والی حویلی'' کے بعد اِن کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ''ستی سر کا سورج'' بھی ایک سنگِ میل ثابت ہوگا، مجھے اِس بات کا یقین ہے۔

پروفیسر قدّوس جاوید (ڈاکٹر)
سابقہ صدر، شُعبہ اُردو، کشمیر یونیورسٹی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

خالد حسین --- کُچھ یادیں کُچھ باتیں

خالد حسین نے جب اپنے افسانوی سفر کا آغاز کیا تو اُس وقت ریاست اور بیرونِ ریاست کے افسانوی منظر نامہ پر ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے چند اُردو افسانہ نگار جیسے ٹھاکر پونچھی، حامدی کشمیری، موہن یاور، علی محمد لون، ویدراہی، پُشکر ناتھ، نُور شاہ، مخمور بدخشی، حسن ساہو، وریندر پٹواری اور برج پریمی وغیرہ چھائے ہوئے تھے۔ خالد حسین کی پہلی اُردو کہانی کا عنوان تھا ''گھر کی جنت''۔ یہ 1969ء کی بات ہے اور یہ کہانی ماہنامہ ''دیہات سُدھار'' میں شائع ہوئی۔ جب یہ کہانی منظرِ عام پر آئی تو ادبی محفلوں اور ادبی گوشوں میں ایک نئی آواز کا احساس اُبھرنے لگا۔ دو چار کہانیاں لکھنے کے بعد خالد حسین کی ایک اور کہانی ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' کے عنوان سے مقامی اخبار میں شائع ہوئی۔ اِس کہانی کی اشاعت کے ساتھ ہی ریاستی انتظامیہ کی سطح پر ایک بھونچال سا آ گیا کیوں کہ اِس افسانے کا مرکزی کردار ایک بیوروکریٹ تھا۔ اِس تعلق سے خالد حسین کو ایک جنگ لڑنا پڑی لیکن خالد حسین نے کہانی کے مثبت پہلو کی روشنی میں یہ جنگ جیت لی اور اُس کے بعد خالد حسین نے پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔

خالد حسین کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دوست بنانے اور تعلقات بڑھانے کے فن سے بخوبی واقف ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی اُس کے دوست و احباب کی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

تعداد بہت زیادہ ہے۔ وہ ایک خوبصورت شخصیت کا مالک ہے۔ اُس کے ہونٹوں پر ہمیشہ پھولوں جیسی نرم و نازک مُسکراہٹ دِکھائی دیتی ہے۔ باتیں کرنے کے انداز میں بھی اُس کی شرافت اور شائستگی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ مَیں جب بھی اُس کی پوری زندگی پر نظر ڈالتا ہوں، تو وہ مجھے آج بھی دوستوں کی محفلوں میں بے تاج بادشاہ کے روپ میں نظر آتا ہے۔

خالد حسین یکم اپریل 1945ء کو اُدھم پور (جموں) میں پیدا ہوا۔ ظاہر ہے کہ اُس کی پیدائش کے دو سال بعد مُلک تقسیم ہوا۔ ہر سمت ایک طوفان بپا ہوا۔ ایک اَن دیکھی آگ پھیل گئی۔ وہ گھر سے بے گھر ہو گیا۔ زندگی کی مسرتوں اور خوشیوں سے محروم ہو گیا لیکن قدم قدم پر طوفانوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ دُور اور نزدیک میں پھیلی ہوئی آگ کو بُجھاتا رہا۔ والدہ صاحبہ نے بڑی مصیبتیں برداشت کر کے پالا پوسا اور پڑھا لکھا کر نہ صرف روزگار کے قابل بنایا بلکہ زندگی کے دُکھوں کو ہنستے ہوئے اپنانے کی ترغیب بھی دی اور پھر رفتہ رفتہ کہانی کار خالد حسین کا روپ نِکھرنے لگا۔

خالد حسین کا پہلا اُردو افسانوی مجموعہ ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' 1981ء میں شائع ہوا۔ پھر ایک اور افسانوی مجموعہ ''اشتہاروں والی حویلی'' 1991ء میں شائع ہوا۔ اب اُس کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''ستی سر کا سورج'' 2011ء میں شائع ہو رہا ہے۔ اِن تینوں افسانوی مجموعوں کی اشاعت کے درمیان جو طویل عرصہ نظر آ رہا ہے اُس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ خالد حسین بُنیادی طور پر پنجابی زبان میں افسانے لکھتا ہے اور یہ کہنا مناسب ہے کہ وہ آج پنجابی زبان کا ایک اہم اور معتبر افسانہ نگار ہونے کی حیثیت سے جانا اور پہچانا جاتا ہے اور برِصغیر ہندو پاک کے پنجابی ادبی حلقوں میں اپنا ایک مُنفرد مُقام بنا چکا ہے۔ پنجابی میں اُس کے اب تک چار مجموعے چھپ چکے ہیں۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''جہلم وگدار یہا''، ''گوری فصل دے سوداگر''، ''ڈونگے پانیاں دا دُکھ'' اور ''بلدی برف دا سیک''۔ پنجابی زبان میں اُس کی چند ایک تخلیقات اور بھی ہیں۔ خالد حسین کے اُردو اور پنجابی افسانوں کے ترجمے انگریزی اور ہندی کے معتبر جریدوں میں چھپتے رہتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ڈوگری، کشمیری اور دوسری زبانوں میں بھی اُس کے افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ اور جموں یونیورسٹی کے نصاب میں خالد حسین کے افسانے پڑھائے جا رہے ہیں۔ لکھنے اور چھپنے کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اِس پسِ منظر میں اُس کی افسانہ نِگاری کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بات ہو رہی ہے خالد حُسین کے اُردو افسانوں کی۔ اُس کی تازہ تخلیق ''ستی سر کا سورج'' میں 22 کہانیاں شامل ہیں۔ مجموعے میں شامل کُچھ کہانیاں تاریخی نوعیت کی ہیں۔ کُچھ افسانے علامتی اور استعاراتی انداز سے لکھے ہوئے ہیں لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ مجموعے میں آج کے کشمیر کی کہانیاں بڑے پُر درد اور کرب ناک انداز میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ بیشتر کہانیوں میں کشمیر کی زندگی کے تلخ اور کڑوی کسیلی حقیقتوں کی عکاسی پُر اثر انداز میں کی گئی ہے۔ اِن کہانیوں میں غمِ ذات بھی ہے اور غمِ دوراں بھی۔ موجودہ دور کے سماجی مسائل اور معاشرتی حالات کے علاوہ اِنسانی رِشتوں کی عکاسی بڑے فنکارانہ انداز سے کی گئی ہے۔ خالد حسین کی زندگی کے بے شُمار تجربات اور مشاہدات نے اِن کہانیوں کو فِکر و فن کے نئے سانچے میں ڈھالنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ خالد حُسین کی کہانیوں میں رومان ہے اور پیار و محبت بھی، لیکن یہ پیار و محبت یا رومان سطحی نہیں ہے۔ اِس کی اپنی ایک گہرائی ہے، گیرائی ہے، ایک خوشبو ہے، ایک مہک ہے۔ ایک ایسی مہک جو صرف محسوس کی جا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سکتی ہے۔ زندگی کے بے شُمار سرد اور گرم موسم دیکھنے کے باوجود آج خالد حسین کے پاس کہنے اور لکھنے کو بہت کُچھ ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو افسانوی روپ دینے میں مصروفِ عمل ہے۔ یہ بھی بڑی مسرّت کی بات ہے کہ اِس تخلیقی عمل میں وہ نہ تو مذہب کی طرف داری کرتا ہے اور نہ ہی کسی مُلک اور نہ کسی قوم کی۔ وہ اپنے افسانوں میں اِنسان اور اِنسانیت کی بات کرتا ہے۔ سچ اور سچائی کی بات کرتا ہے۔ وہ بات کرتا ہے وفا کی، وفاداری کی، اعتماد اور بھروسے کی، امن، آشتی اور سلامتی کی۔ وہ اپنے افسانوں میں تہذیبی زندگی کے کُھردرے پن اور تضادات کی بات کرتا ہے۔ اُس خلیج کی بات کرتا ہے، جو ایک ناسور بن کر ہماری قومی شخصیت اور ہماری انفرادیت کو داغدار بنا رہا ہے اور میری نظر میں اُس کی کہانیوں کی کامیابی کا سب سے بڑا راز اِن ہی باتوں میں پوشیدہ ہے۔ اِس تعلق سے اُس کی کہانیوں سے چند اقتباسات دیکھیے:

''اُن کا مُرشد اپنے جسم پر سات رنگوں کا چولا پہنے گھومتا تھا مگر اُس چولے کو آگ کے شعلوں نے جلا ڈالا۔ راکھشسوں نے نُندرشی کو اپنی طرف سے ننگا کر دیا تھا، لیکن وہ ننگا نہیں ہوا تھا۔ اُس کے جسم پر پاکی اور قلندری کا لباس تھا جو کوئی بھی نہ اُتار سکا۔ طاقت اور دہشت ستی سر کی شناخت ختم کرنا چاہتی ہے، پر ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ہمیں سُولی پر تو لٹکایا جا سکتا ہے۔ ہمارا سر دھڑ سے تو الگ کیا جا سکتا ہے لیکن سچ اور حق کو جُھکایا نہیں جا سکتا۔ ہم ظاہری عقائد اور سیاسی دستور کے پابند نہیں ہیں۔ ہم مست مولا ہیں۔ ہمارے پاس فقیری کا چولا ہے۔ درویشی کی دولت ہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

صوفیوں کی رمز ہے۔ اور رَبی عشق کی مستی ہے''

(از: ''ستی سر کا سورج'')

''بھارت اور پاکستان کے رشتوں کے بارے میں یہ محاورہ پوری طرح صادق آتا ہے کہ لوہار کی سانسی کبھی آگ میں اور کبھی پانی میں۔ ایسے رشتوں کے باوجود بھی دونوں حکومتوں کا یہ فیصلہ قابلِ ستائش تھا کہ کشمیر کے دونوں اطراف بسنے والے لوگوں کو آپس میں ملنے دیا جائے''

(از: ''لکیر'')

''اُس نے فیصلہ کرلیا کہ جھوٹے رشتوں کے جال سے جتنی جلدی باہر نِکلا جائے اُتنا ہی اچھا ہے۔ اُس کے پاس جتنے بھی سانس باقی بچے تھے وہ اُس کی زندگی کا کُل سرمایہ تھے اور وہ اپنی بچی ہوئی سانسوں کو اب ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے دِل کے طاقچے سے یادوں کی کتابیں، موہ کی پوٹلیاں اور خواہشوں کی گانٹھیں اُٹھا کر باہر پھینک دیں۔۔۔ اُس نے اپنے ساتھ بیتے حادثات کے اتہاس کو سینے کی قبر میں دفن کر دیا۔ اپنے کرموں کی رُوئی کو دُھنا۔ عملوں کے چرخے پر سُوت کاتا۔ انحد کی کھیسی بُنی۔ رُوح کو کھیسی میں لپیٹا اور یوں زندگی کے دریا کو شانت ساگر کے اندر جذب کر دیا۔۔۔''

(از: ''پریم کھیلن کا چاؤ'')

''جناب! دیش کیا آزاد ہوا، ہمارے لیے عذاب ہو گیا۔ ہم

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

تیسرے درجے کے شہری بن گئے۔ ہماری حالت شُودروں سے بھی بدتر ہوگئی۔ ہماری پہچان مُلک دُشمن، غدّار، جنُونی اور دہشت گرد کی بنادی گئی ہے۔ ہمیں ہر میدان میں پچھاڑ دیا گیا ہے۔ ہم غُربت اور مسکینی کی بھٹی میں جل رہے ہیں۔ ہم لاچار ہوچکے ہیں۔ ہماری لاچاری پربت سے بھی بھاری ہے۔۔''

(از: ''آدمی کے اندر چُھپا آدمی'')

''سیاست کا ایک دمن چکر چل رہا ہے۔ کبھی آگ بھڑکائی جاتی ہے اور کبھی بُجھائی جاتی ہے۔ گولہ بارود کا یہ کھیل دونوں طرف سے کھیلا جارہا ہے۔ انہیں کون سمجھائے کہ بارود کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ ٹینک اور توپیں کسی عقیدے سے وابستہ نہیں ہوتیں۔ یہ ہمارے پاس ہوں یا اُن کے پاس، اِن کا کام تباہی اور بربادی پھیلانا ہے۔ اِن کا دھرم دھرتی کو بانجھ بنانا ہے۔ ہلاکتیں کرنا ہے۔ گولی اپنی ہو یا پرائی۔۔ یہ زندگی کا شکار کرتی ہے۔ آنسو رُلاتی ہے۔ سُہاگ اُجاڑتی ہے۔ یتیم بناتی ہے۔ ماؤں کی گود سونی کرتی ہے۔''

(از: ''دردِ چھوڑے کا حال'')

''پنڈت جی! بھلا ہم آپ کو کیسے بھول سکتے ہیں۔۔۔ ہمارا خون ایک ہے۔ ہماری نسل ایک ہے۔ ہماری زبان ایک ہے۔ ہمارا تمدّن ایک ہے۔ تہذیب ایک ہے۔ ہمارے سنت فقیر اور رِشی سانجھے ہیں۔ ہمارے گیت سانجھے ہیں۔۔۔ وہاں ہر کوئی اپنے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

پھل کو میٹھا کہتا ہے۔ کھوٹی تو ہماری تقدیر ہے۔ بڑی طاقتیں بیان بازیاں کر کے ہمارے زخموں پر نمک چھڑکتی رہتی ہیں۔ یوں سمجھیں کہ رَنڈی کے گھر منڈی لگی ہوئی ہے۔۔"

(از: "سانجھا درد")

"راجاں کوئی بہتی ہوئی شہتیری نہیں تھی جسے نواب دریا سے پکڑ کر لایا ہو۔ وہ تو بھری بہاروں کی گھنی چھاؤں میں پلی بڑھی، ہنستے بستے گھر کی اولاد تھی۔۔۔ سہاگ رات کو صندلی رنگ کی راجاں صندل کی گہری خوشبو کی طرح نواب کے دِل میں اُتر گئی تھی۔ اُس کے گالوں پر بہاریں مُسکرا رہی تھیں۔ عنابی ہونٹوں پر مستی کی چمکنائی تیر رہی تھی۔ گہری سیاہ زُلفیں جب پھنکارتے ہوئے سانپ کی طرح مخملی تکیے پر بکھریں تو نواب سے رہا نہ گیا۔ وہ اپنے بے قابو من کو گرم گرم سانسوں کی ٹکور دینے لگا۔۔۔"

(از: "حلالہ")

یہ اقتباسات پیش کرنے کا میرا مقصد یہ ہے کہ خالد حسین کی تحریروں کا ایک مختصر سا جائزہ سامنے آئے۔ اُس کے قلم میں جو شگفتگی اور شائستگی ہے، اُس کا اظہار ہو۔ زبان پر جو اُس کی گرفت ہے، اُس کا تجزیہ کیا جائے اور اُس کی فنی مہارت کی پہچان ہو سکے۔

خالد حسین اپنی کہانیوں کا مواد زمین کی کُھردری سطح اور اِرد گرد کے ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کے اُس کی کہانیوں میں جہاں حُسن و جمال اور پیار محبت کی نزاکتیں ملتی ہیں، وہیں موجودہ پُر آشوب دَور کی تصویریں بھی دیکھنے کو ملتی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہیں۔ یہ تصویریں ضرور بدصورت ہیں لیکن خالد حسین اِس بدصورتی کو خوبصورتی میں تبدیل کرنے کا خواہاں ہے۔ وہ اِن تصویروں کے ذریعہ امن اور سلامتی سے بھرپُور زندگی کا احساس دِلانا چاہتا ہے اور ایک نئی فِضا قائم کرنا چاہتا ہے۔ میری نیک خواہشات اُس کے ساتھ ہیں۔

نورشاہ

(افسانہ نگار)

للّہ دید کالونی راولپورہ سرینگر

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہمعصر ادیبوں کی آراء

خالد حسین پنجابی ادب میں ایک بڑا نام ہے۔ مَیں نے اُن کی کئی کہانیاں پڑھی ہیں۔ وہ اُردو کے بھی ایک منجھے ہوئے افسانہ نِگار ہیں اور اُن کے افسانے ہندوستان اور پاکستان کے معتبر جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔ شب خون، الفاظ، سطور، شاعر، تحریکِ ادب، گُفتگو، آجکل، پاسبان، شمع اور کئی دیگر ماہنامے اُن کے اُردو افسانوں کی زینت بنے ہیں۔ بیشتر افسانوں کا ترجمہ انگریزی، ہندی اور دوسری زبانوں میں ہو چُکا ہے۔ اپنے مُنفرد لہجے، فنی چابکدستی، دِل کو چھو لینے والی ڈِکشن اور اچھوتے موضوعات کی وجہ سے اُنھوں نے برِصغیر ہند و پاک کے پنجابی اور اُردو ادبی حلقوں میں اپنی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ کنوار گندل، گہرے پانیوں کا دُکھ، حلالہ، انتظار کا قیدی اور ستی سر کا سورج اُن کے عمدہ افسانے ہیں، جن کا مقابلہ کسی بھی بڑی زبان کے افسانے کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ خالد حسین کے افسانے وسیع مطالعے، تجربے اور مشاہدے کی دلیل ہیں۔ اُن کے افسانوں میں تواریخ، سماجیات اور سیاسیات کا ایک پورا منظر نامہ مِلتا ہے۔

فخر زماں (ناول نگار اور شاعر)
سابقہ وزیر اور سابقہ چیئرمین، پاکستان اکادمی آف لیٹرز،
ماڈل ٹاؤن، لاہور (پاکستان)

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

خالد حسین کی کہانیاں جموں و کشمیر کے ادبی سرمائے میں نمائندہ حیثیت رکھتی ہیں۔ کہانی لکھنے کا اُن کا اپنا انداز ہے۔ زبان میں غنائیت، طنز کی چاشنی، اچھوتے پلاٹ اور دِلکش اسلُوب اُن کی پہچان ہے۔ علامتی لہجہ اور الفاظ کی تہذیب اور فنی رموز پر دسترس اُن کی خصوصیت ہے۔

ڈاکٹر ستیندر سنگھ نُور (مرحوم)

(نقاد)

سابقہ نائب صدر، ساہت اکادمی، نئی دہلی

خالد حسین اپنے تخلیقی عمل میں نہ کسی مذہب سے وابستہ ہوتے ہیں اور نہ کسی مُلک سے۔ جُغرافیائی حدیں اور سرحدیں اُن کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ زبان کی خوبصورتی، مُنفرد پیش کاری اور فنکارانہ اسلُوب اُن کی فطری اور حقیقی حصُولیابی ہے۔

ڈاکٹر وریام سندھو

(پنجابی افسانہ نِگار)

خالد حسین اپنے موضوعات کا شعوری انتخاب کرتے ہیں اور گِرد و پیش کی معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کے تضادات اور کُھردرے پن کو شدّت سے محسوس

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کرتے ہیں اور اِسی سے افسانہ لکھنے کی تحریک پاتے ہیں۔

ڈاکٹر حامدی کشمیری

(نقاد، افسانہ نِگار)

سابقہ وائس چانسلر، کشمیر یونیورسٹی

خالد حسین کے افسانے پڑھنے میں دوہرا مزا دیتے ہیں۔ ایک تو اُن کے افسانے ہمارے گِرد و پیش کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اور دوسرا، زبان کے استعمال کا کمال دیکھنے کو ملتا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ اُن کی بیشتر کہانیاں دِلوں کی دُوریاں مِٹانے کی طاقت رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر للت مگوترا

(افسانہ نِگار)

سابقہ صدر، فزیکس و کمپیوٹر سائینسز ڈیپارٹمنٹ،

جموں یونیورسٹی

خالد حسین کی کہانیوں میں شبد شکتی، اِنسان اور اِنسانیت کے تئیں اُن کی ادبی ذمہ داری کا جذبہ، مذہبی سیاسی اور سماجی مسائل کھڑا کرنے والی مخالف طاقتوں کو پُر امن

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ڈھنگ سے شکست دینے کی بے لوث کوشش کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی تحریر کا اہم مُدّعا اِنسانی قدروں کی آبیاری کرنا ہے۔ امن دوستی اور محبت کے لیے خالد ہندوستان اور پاکستان میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔

ڈاکٹر اگنی شیکھر
(ہندی کہانی کار اور شاعر)

خالد حسین کی کہانیوں میں افسانویت، اُن کے اسلوب کی رہینِ مِنّت ہے۔ رمز نگاری کا پیرائیہ بیان اُنھیں مرغوب ہے اور وہ استعاراتی طرزِ بیان اختیار کر کے قارئین اور ناقدین سے اپنی علاحدہ حیثیت منوا لیتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں فقروں کے چٹخارے اور معنویت کی لذّت قاری کو منٹو کی یاد دِلاتی ہے۔

ڈاکٹر زینت اللہ جاوید
سابقہ ہیڈ، نواب شیر خان انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز،
(پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ)، مالیر کوٹلہ، پنجاب

خالد حسین کو جب ملتا ہوں تو اُس کا اپنا پن، دِلچسپ باتیں، لطیفے ایک ایسا عالم طاری کر دیتے ہیں کہ اپنی دُنیا اور اپنا آپ اچھا لگنے لگتا ہے۔ جب خالد کے افسانے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

پڑھتا ہوں تو اُس کی با محاورہ اور چٹخاری زبان، اُس کی کہانی میں کہانی پن، جاندار کردار اور بیان کا جادو، دِل کو موہ لیتا ہے۔ مجھے وہ مشرقی اور مغربی پنجاب کے درمیان بیٹھا ہوا ایک ایسا درویش لگتا ہے جو پانچ دریاؤں کی لہروں کا ترجمہ کر رہا ہو۔

سُرجیت پاتر (ڈاکٹر)

(پنجابی شاعر)

خالد حسین کی کہانیوں میں ایک ایسی دُنیا آباد ہے، جو اُس کی نِصف صدی کے ذہنی سفر کی غمّاز ہے۔ ایک بڑے پردے پر اُس کے تمام تر محسوسات پرچھائیوں کی مانند اُبھرتے ہیں اور پھر ایک ایسی بڑی تصویر کی تخلیق کرتے ہیں جو اس کے کِردار کا اصل ہیں۔ اُس نے بڑی ایمانداری سے دُنیا کو ایک ایسا آئینہ دِکھایا ہے، جو جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ ایک سچا ادیب ہے اور اُس نے پنجابی اور اُردو میں لِکھ کر ''ڈُگر'' کا نام رَوشن کیا ہے۔ ہم سب ڈوگری ادیب اُس پر فخر کرتے ہیں۔

ویدراہی

(ڈوگری، اُردو افسانہ نگار)

فلم ساز اور ہدایت کار، مُمبئی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی

مَیں اپنی بات گائتری منتر سے شروع کرنا چاہتا ہوں جو اِس طرح ہے:

''اے خُدائے عِزّ وجل، خالقِ ارض وسما، مالکِ کون ومکاں، منبعِ لُطف وکرم، واحد ویکتا ہے تُو، بے نظیر وبے مثال، قادرِ مُطلق ہے تُو، اور نہ کوئی انتہا، تیرے دم سے ہے رواں، زندگی کا کارواں، نُور کا دریا ہے تُو، تیرے جلوے سُو بہ سُو، تیری ذاتِ پاک پر ہم دِل و جان سے فِدا، تُو ہماری عقل کو کامل وپُختہ بنا، نیک رستے پر چلا''۔

(مہارشی وشوامتر)

خُداوندِ برحق کی حمد وثنا میں ڈوبا یہ گائتری منتر اِنسان کے نفس کو پاک وصاف کرتا ہے اور بندوں کو اخوّت کا درس دیتا ہے۔ اِسی طرح قُرآنِ پاک میں سورہ رحمان کی یہ آیات اِنسان کے لیے پند ونصیحت کا خزانہ ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ قُرآنِ مجید میں اپنے بندوں سے فرماتا ہے:

اے فنا انجام اِنسان کب تُجھے ہوش آئے گا
تیرگی میں ٹھوکریں آخر کہاں تک کھائے گا
اِس تمرّد کی روش سے بھی کبھی شرمائے گا
کیا کرے گا سامنے سے جب حجاب اُٹھ جائے گا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

ہر نفس طوفان ہے ہر سانس ہے اک زلزلہ

موت کی جانب رواں ہے زندگی کا قافلہ

مُضطرب ہر چیز ہے جُنبش میں ہیں ارض و سما

اِن میں قائم ہے تو تیرے رب کے چہرے کی ضیا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جُھٹلائے گا

(منظوم ترجمہ۔ جوشؔ ملیح آبادی)

بھگوان کرشن نے بھی اِنسان کے اندر کی پلیتی اور گندگی صاف کرنے اور امن وشانتی کا سبق پڑھانے کے لیے گیتا میں فرمایا ہے:

''جن لوگوں کا من قابو میں ہے۔ جو دُشمنوں اور دوستوں کو ایک جیسا سمجھتے ہیں۔ جن کے من میں تعصب نہیں ہے اور جو بے غرض ہو کر سب کی بھلائی کرتے ہیں، وہ سب سے شریشٹھ ہیں اور کرم بندھن سے نجات حاصل کرتے ہیں''۔

غرض، وید، پُران، اُپنشد، سامی کتابیں، سنت، رشی مُنیوں کی بانی اور صوفیائے کرام کا کلام، سب اِنسان کو اِنسان سے محبت کرنا سِکھاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اِنسان سے محبت ہی خُدا سے محبت ہے لیکن اِن سُنہری تعلیمات کو بظاہر ماننے والے اور دھرم کا ڈھول پیٹنے والے لوگ آج کس راستے پر چل نکلے ہیں۔ کون سے مذہبی عقائد کی پیروی کر رہے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر ہر ذی شعور اِنسان کا دِل جلتا ہے۔ آج کا ماحول حساس لوگوں اور سچ کے پرستاروں کو خون رُلاتا ہے کیوں کہ آج کا اِنسان ترقی یافتہ، سائنسی علوم میں لبالب اور تکنیکی طور پر عروج حاصل کرنے کے باوجود جہالت اور غفلت

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

میں جی رہا ہے۔ وہ زمین میں اناج کی جگہ بارود اُگاتا ہے۔ آسمان سے بارش کے بدلے بارود برساتا ہے۔ آج راکھشسوں نے دُنیا کو فنا اور بقا کے بھنور میں ڈبو دیا ہے۔ فتنہ پرور اور طاقت ور مظلوموں اور ناداروں کو موت، دہشت، ذِلّت اور خوف و رسوائی کے مقتل پر چڑھا رہے ہیں۔ آج مذہب کی غلط تشریح ہو رہی ہے۔ دھرم کی اصل رُوح کو بیدار کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ نفرت اور ریاکاری کے جال میں امن بُری طرح پھنسا ہوا ہے۔ اِنصاف در بدر ہے۔ انتقام کے لشکر چاروں طرف دندنا رہے ہیں۔ موت کے شکاری زندگی کا شکار کرنے کے لیے ہر وقت گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ عقل و دانش، دہشت اور وحشت کی غلام بن چکی ہے۔ کوئی بھی طاقت کو محبت کے سُپرد نہیں کرتا تاکہ ماحول معطر ہو۔

سامراجیت کی بربریت، دھرتی پر غلاظت کے انبار لگا رہی ہے۔ ہر طرف لاشوں کی بدبو پھیلی ہوئی ہے۔ ہماری دُنیا ایک خاردار جنگل بن چکی ہے جس میں خود غرض اور بدخصلت لوگوں نے بے بس اِنسانوں کو نیزوں پر لٹکایا ہوا ہے۔ آج خود پرستی، منافرت، عداوت اور جنونی سیاست نے تباہی مچائی ہوئی ہے۔ راج دھرم نیلام ہو چُکا ہے۔ مذہب کی اِس سے بدترین توہین اور کیا ہوگی کہ اِس کو مفاد پرست اور فسادی لوگ جنون کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بھگوان کے مندر اور خُدا کے گھر خوف و ہراس کے مرکز بن گئے ہیں۔ تنگ نظر اور جنونی اپنے حیوانی نظریات کا اظہار اب کھُلم کھُلا کر رہے ہیں اور طبقاتی منافرت پھیلاتے ہیں۔ جب کہ نام نہاد جمہوریت، کھوکھلا سیکولرازم اور بے کار قانون اِن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایسے ماحول میں اِنسان کہاں پناہ لے۔ کس سائبان میں سکون تلاشے۔ کون سے معبود کی پرستش کرے۔۔۔ مگر یہ طے ہے کہ فلسفہ چاہے کوئی بھی ہو وہ اِنسانی ذہن و دِل پر بوجھ نہیں بننا چاہیے اور اِس کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

لیے ہمیں اپنے ماضی کے اُس تابناک دَور میں جانا ہوگا جب ہندوستانی جیون میں مذہبی عقائد کے دقیانوسی ٹکراؤ سے اُکتا کر رواداری اور تال میل کے راستے تلاش کرنے کے لیے ہندو اور مُسلمانوں نے بھگتی مت اور صوفی مت کو گلے لگا کر سماجی ایکتا، امن و آشتی اور محبت کے گیت گائے تھے۔

سنتوں اور صوفیوں نے اِنسانوں سے گہری ہمدردی، محبت اور دِل کی پاکیزگی کا پیغام دیا۔ کشمیر میں بھی رِشی مُنیوں اور سنت صوفیوں نے بُنیاد پرستی اور مذہبی تنگ نظری پر چوٹ لگائی اور امن و بھائی چارے کا سبق پڑھایا۔ للّہ عارفہ اور شیخ العالم اِس کی مثال ہیں۔ پنجاب میں بابا فرید، بابا نانک سے لے کر بُلھے شاہ تک تمام صوفیوں نے ارض وسما میں معرفت اور طریقت کی خوشبو بکھیری۔ ''ستی سر کا سورج'' میں درج بیشتر افسانے رواداری اور محبت کے اِسی جذبے کی عکاسی کرتے ہیں۔ امن وشانتی کے ابدی پیغامات کو ہر دِل کی دھڑکن بنانے کے لیے مَیں نے سادہ، پُراثر اور خوبصورت لفظوں کا ہدیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی تحریر میں روحانیت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ زبان کا ترنم جگانے کی سعی کی ہے اور خُدا سے دُعا کی ہے کہ ہم سب کو عقل و دانش عطا کر اور ہمارے نفس منوّر کر، کیونکہ شہید صوفی سرمد نے کہا ہے کہ علم کی روشنی کے رتھ پر سوار ہو کر کائنات کے بیابان میں سفر کر اور عشقِ سرمدی میں تحلیل ہو جا۔ اِس لیے ہمیں چاہیے کہ ترشول و خنجر، بندوق اور بارود کو قبرستان میں دفن کر دیں، شمشان میں جلا دیں اور قلم سے تخلیقی جہاد کریں۔ شر کو شرمسار کریں اور زندگی کو خیر کے جام پلائیں۔

میری کہانیوں میں آج کے عہد کا المیہ ہے۔ مُلک کی تقسیم کے زخم ہیں۔ بڑی طاقتوں کی بے رحم سازشوں کی داستانیں ہیں۔ اِن کہانیوں میں بھارت اور پاکستان کی دائمی رنجش کی وجہ سے کشمیر میں پھیلی تباہی اور موت کا تانڈو ملے گا۔ یتیموں اور بیواؤں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کی آہیں ملیں گی۔ لُٹی عصمتوں کی چیخیں ملیں گی۔ بے سروسامانی کے قصے ملیں گے لیکن ایک ادیب ہونے کے ناطے میری ذات اور میرے وجود میں بھارت اور پاکستان دونوں گلے ملتے نظر آئیں گے کیوں کہ یہ دونوں مُلک دھرتی کی ایک ہی کوکھ سے جنمے ہیں اور یہ بات سیاست، مذہب، طاقت اور دہشت، سب کو سمجھ لینی چاہیے۔ انھیں اپنے ناپاک منصوبوں اور ہتھکنڈوں سے باز آنا چاہیے تاکہ یہ خطہ امن کا گہوارہ بنے۔ سامراجی طاقتوں کو بھی ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' کا فارمولہ ترک کر کے دُنیا کو آزاد فضا میں جینے کا حق دینا چاہیے۔ مظلوم اور محکوم قوموں کو طاقت کے بل بوتے پر غلام بنانے کی روش چھوڑ دینی چاہیے۔

مَیں پروفیسر قُدوس جاوید صاحب کا ممنون ہوں جنھوں نے اِس افسانوی مجموعہ کا پیش لفظ لکھا اور میرے تخلیقی عمل کی کئی پرتیں کھولیں۔ اُردو کے نامور افسانہ نگار نُور شاہ صاحب میرے بڑے بھائی اور محسن ہیں۔ ہم دونوں نے لمبا عرصہ ایک ساتھ گُزارا ہے۔ اُن کی صحبت میں رہ کر ہی مجھے اُردو میں کہانیاں لکھنے کی تحریک ملی۔ مَیں اُن کا بھی شُکر گُزار ہوں کہ اُنھوں نے ''کُچھ یادیں کُچھ باتیں'' کے عنوان سے اپنے تاثرات قلمبند کیے جو اِس کتاب کا حصہ ہیں۔ مَیں امین بنجارہ صاحب اور اپنے عزیز وزیر محمد میر کا بھی احسانمند ہوں، جنھوں نے میرے اِن افسانوں کو کتابی صورت میں قارئین کے روبرو لانے میں میری مدد کی۔

خالد حسین

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

افسانے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ستی سر کا سورج

وہ سوریہ ونشی سلر سین کا بیٹا تھا۔ سدرا اور سالار کا سورج۔ اُس نے پیدا ہوتے ہی دُنیا کی بے ثباتی کو دیکھ کر ماں کا دُودھ پینے سے اِنکار کر دیا تھا لیکن للیشوری کی گود میں بیٹھ کر اُسے سکون مِلا تھا۔ للیشوری اُس کی دُودھ ماں تھی جس نے اُسے اپنی چھاتی کا دُودھ پلایا تھا اور اُس میں محبت اور اِنسانیت کی مصری گھول کے پلائی تھی۔ وہ ایک ایسا چور تھا جس کو اُس کے بھائیوں نے چوری کرنی سِکھانا چاہی مگر وہ دُنیا کی تمام قیمتی چیزوں کو چھوڑ کر محبت کا آٹا چوری کر کے لے گیا اور طریقت کے چھاننے میں چھان کر عرفان کے تندور میں روٹیاں پکانے لگا اور خلقت کو کھلانے لگا۔ وہ ایک ایسا آوارہ گرد تھا جس کی خرمستیوں سے تنگ آ کر ماں سدرا نے اُسے شادی کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا لیکن وہ زنجیریں توڑ کر اور سب کچھ چھوڑ کر ربّی گیان کی تلاش میں ایک غار کے اندر جا بیٹھا اور بارہ سالوں تک کرم گیان کے چرخے پر اپنے عملوں کا سُوت کاتتا رہا۔ یوون نار اُسے اپنے حُسن کا گُلقند کھلانے اور واسنا کے جال میں پھنسانے کے لیے اُس غار میں گئی تھی لیکن فقیری چولا پہن کر باہر نکلی تھی۔

اُس کا نام نُور تھا۔ وہ محبت اور معرفت کی چٹائی پر بیٹھ کر لوگوں کے دِلوں کو اپنی نُوری کرنوں سے روشنی بخشتا تھا۔ اُس کی محبتی آنکھ عیب نہیں دیکھتی تھی۔ وہ محبت کا نُوری کلمہ پڑھتا رہتا اور لوگوں سے کہتا کہ رَب ہی ساری خلقت کا خالق و مالک ہے۔ اِس

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

لیے رب کو اپنی ذاتی جاگیر نہ بناؤ اور خُدائے برتر کے نام پر دھرتی پر فساد نہ مچاؤ۔ اُس کا کہنا تھا کہ اپنے اندر پاکی اور نیکی کا پودا اُگاؤ تاکہ پیار سمندر دِل کے اندر دھمال مچائے اور رب سچے کا وصال کرائے۔ وہ کہتا کہ اپنے دِلوں پر محبت اور نیکی کا جھاڑو پھیرتے رہو اور دِلوں کے مکّے اور شوالے کو زم زم اور گنگا جل سے دھوتے رہو تاکہ نفرت اور بُرائی تم سے کوسوں دُور رہے۔ وہ سمجھاتا کہ اپنے من کو قابو میں رکھو اور نفس کے کُتّے کو عزت اور غیرت بیچ کر مت پالو بلکہ اُسے بھوکا مار دو۔ وہ بندہ رب کا تھا اور خادم سب کا تھا۔ وہ کامل صوفی درویش تھا، جو مسجد میں بیٹھ کر سنکھ بجاتا اور مندر میں بیٹھ کر نماز گُزارتا۔ وہ اپنی ماں للیشوری کی گود میں بیٹھ کر معرفت کی کھیلیں کھیلتا رہتا۔ دونوں نے مل کر اپنے واکھوں اور شلوکوں سے امن، شانتی، ایکتا اور دوستی کی جوت جگائی تھی۔ وہ لوگوں کے دِلوں پر راج کرتا تھا اور لوگ اُسے پیار سے نُند رشی کہتے تھے کیوں کہ وہ رانجھا سب کا سانجھا تھا۔

اُس کی عزت، عقیدت اور شُہرت وہاں کے راکھشس کو کانٹے کی طرح چُبھتی تھی۔ وہ اُس سے نفرت کرتا تھا۔ دُشمنی اور حسد کی آگ نے اُس راکھشس کو جلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ نُور کی روشنی مٹانا چاہتا تھا۔ وہ گنگا جل اور زم زم کو لڑانا چاہتا تھا۔ اُس کا نام حاکم تھا۔ دھرتی پر راج کرنے والا حاکم۔ لوگوں کو غُلام بنانے والا حاکم۔ اپنے سامراج کے نشے میں چُور رہنے والا حاکم۔ اُن دونوں کا اکثر مقابلہ ہوتا۔ ایک طرف امیری کی مغروری تھی اور دوسری طرف فقیری کی صبوری تھی۔ نُور کہتا تھا کہ حاکم لوگوں کے دِلوں پر حکومت کرے، اُن کے جسموں پر نہیں۔ وہ حاکم کو درس دیتا کہ اِنسان کا شکار احسان سے کرے۔ پیار اور محبت سے اُن کا دِل جیتے، ظُلم سے نہیں، کیونکہ ظُلم ایک بیماری ہے اور رحم اُس کی دوا ہے۔ نُور اُسے نصیحت کرتا کہ وہ اپنی آتم کتھا میں سے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''مَیں'' کا شبد باہر نکال دے ورنہ حسد اور نفرت کی آگ میں جل کر ختم ہو جاؤ گے۔ وہ کہتا کہ یہ ''مَیں'' تباہی اور بربادی لاتی ہے۔ شکر کی طرح میٹھی زندگی میں زہر گھول دیتی ہے۔ اِنسان کو تیزاب میں نہلاتی ہے۔ یہ لفظ ہستی اور مستی کا دُشمن ہے پر اُس راکھشس نے نُور کی ایک نہ سُنی۔ اُس کا کہنا تھا کہ اُس کی آتم کتھا میں سب سے اہم کِردار ''مَیں'' ہی ہے۔ اُسے اپنے اندر سے کیسے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ حاکم نے نُور کو سُقراط و منصور سمجھا اور اُس کی باتوں کو جُھٹلانے لگا۔ وہ اُس کے پروچن سُن سُن کر بے چین ہو گیا اور اُس نے نُور کو سبق سِکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اُس کے ساتھ جنگ کر کے اُسے ہستی سے مٹانا چاہتا تھا۔ اُسے سولی پر لٹکانا چاہتا تھا۔ بھلا! حاکم اور اُس کا سامراج اپنے باغی کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ حاکم نے اپنی آپ بیتی کے اہم کردار ''مَیں'' کو اپنے ساتھ ملایا اور ایک بڑا لشکر تیار کیا اور رن بھومی میں اُسے للکارا۔ حاکم کے ساتھ غرور، تکبّر، نفرت، عداوت، دہشت اور طاقت ایسے شستر تھے اور نُور کے ساتھ فقیری، درویشی، خلوص، محبت، طریقت اور معرفت جیسے سنگی ساتھی تھے۔ حاکم کے پاس اہنکار کی کٹار تھی اور نُور کے پاس عقل اور دانش کی تلوار تھی۔ وہ روحانیت کا پرچم لے کر شیطانی طاقت کی طرف بڑھا۔ بڑی زوردار جنگ ہوئی۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ حاکم کے سارے ہتھیار ٹوٹ گئے اور فقیری جنگ جیت گئی۔ ''مَیں'' کا غرور چکنا چُور ہوا اور تکبّر ٹوٹ گیا لیکن حاکم نے ہار نہیں مانی۔ اُس کا کہنا تھا کہ سرداری کبھی شکست نہیں کھا سکتی۔ سامراج کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اُس نے اپنی چال بدلی۔ راج نیتی کی ڈھال بدلی اور آہستہ آہستہ دوبارہ اپنی فوج تیار کرنے لگا۔ اُس نے ادھرمی دھرماتماؤں اور جنونی مُلّاؤں کو اپنے ساتھ ملایا۔ اُن کے سامنے دولت کا ڈھیر لگایا اور اُن کے ہاتھوں میں دھرم زنجیریں دے دیں تا کہ معصوم بچوں کے دِل اور دِماغوں کو قید کیا جائے۔ اُن کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اندر جنون اور کٹر واد کی پنیری اُگائی جائے۔ لفظوں کی جادوگری سے اُنھیں اگیانی بنایا جائے۔ امن، شانتی اور دوستی جیسے الفاظ کو بے مطلب بنایا جائے۔ آہستہ آہستہ جنون، تنگ نظری اور کٹر واد کی پنیری نے اپنی جڑیں پکڑ لیں۔ دھرم جنون پھیلنے لگا۔ کام، کرودھ اور لوبھ اپنے آکار بڑھانے لگے۔ آندھی چلنے لگی، سُنامی لہریں اُٹھنے لگیں۔ دھرتی کانپنے لگی۔ ہر طرف کانٹوں کی جھاڑیاں اُگنے لگیں۔ دھرم اور راج نیتی نے دِلوں میں نفرت کا زہر بھر دیا۔ فقیری اور درویشی دم توڑنے لگی۔ سادھ اور سنتوں کے تکیے اُجڑنے لگے۔ لوگ ''اللہ ایشور تیرو نام'' کو چھوڑ کر بارُود کی پوجا کرنے لگے۔ وید، گرنتھ، پُران اور سامی کتابیں دفن کر دی گئیں۔ نئے گرنتھ لکھے جانے لگے۔ جہاد اور فساد کا فلسفہ پروان چڑھنے لگا۔ گھروں، سڑکوں اور کھیتوں میں بم بیجے گئے۔ مکر اور فریب کی دُکانیں مندروں اور مسجدوں میں سجائی گئیں۔ حاکم خوش تھا۔ پھر اُس نے پوری تیاری کے ساتھ جنگ شروع کی۔ میدانِ جنگ خون سے سُرخ و لال ہوا۔ محبت، ایکتا، امن، شانتی، معرفت اور روحانیت سب ہار گئے۔ درویشی، فقیری اور صبُوری کی گردن مروڑ دی گئی۔ شرافت، صداقت اور برکت کا جنازہ نکال دیا گیا۔ لوگ سامراج کی طاقت کے آگے جھک گئے۔ زندگی کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ وحشت اور دہشت نے اِنسانیت کا لباس تار تار کر دیا۔ ہر طرف جنونی گھاس کے گھنے جنگل بن گئے۔ سانجھ اور پیار کے رشتے آگ اور لہو میں بھسم ہو گئے۔ وقت ایسا آیا کہ بھائی بھائی سے ڈرنے لگا۔ شک اور نفرت نے بھائیوں میں لکیر کھینچ دی۔ سچ اور محبت کی دولت، دھرم اور سیاست کے مرتبانوں میں قید کر دی گئی۔ پھر عزت اور شرافت کی دستار مٹی میں مل گئی۔ عورتیں چوراہوں پر ننگی کی گئیں۔ پھر لوگوں نے غُنڈوں کی سرداری دیکھی۔ شریفوں کی لاچاری دیکھی۔ عِلموں اور عقلوں والے گھاس کے بھاؤ تولے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گئے۔ خلقت کی تباہی کچھ ڈر اور خوف نے کی اور کچھ کلاشنکوف نے کی۔ دھرتی بانجھ ہوگئی۔ وحشی جانوروں نے عورت کی کوکھ کو مالِ غنیمت سمجھا۔ بچے دانیاں لہولہان ہو گئیں۔ اُنھوں نے بچے پالنے چھوڑ دیے۔ بچوں کے جھولے ٹوٹ گئے۔ لوریاں جم گئیں۔ آنسو خشک ہو گئے۔ خواہشوں کے گھروندے ٹوٹ گئے۔ طاقت اور دہشت نے اتنے دُکھ دیے کہ گھروں کی چھتوں نے کسی کو چھاؤں نہیں دی۔ آنگن خالی ہو گئے۔ دھرم اور سیاست کا وہ دمن چکّر چلا کہ قُدرت شرمسار ہوگئی۔ ساری عبادتیں اور پرارتھنائیں اندھی ہوگئیں۔ بارود نے زندگی اور موت کے درمیان کا فاصلہ مٹا دیا۔ بدکاری اور بدچلنی عام ہوگئی۔ بے حیائی سڑکوں پر ناچنے لگی۔ لوگ گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اُن گھروں کو جہاں اُن کا ماضی رہتا تھا۔ گھروں نے اپنے مکینوں کو بہت روکا کہ وہ اپنے ماضی کو چھوڑ کر نہ جائیں۔ اُس ماضی کو جس پر اُنھیں ناز تھا۔ جو اُن کی پہچان تھا۔ لیکن وہ موت اور دہشت کو اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتے دیکھ کر بھاگ گئے، قافلوں کی صورت میں۔ اُنھوں نے پرائی دھرتی پر ڈیرے جما لیے۔ اُن کی پہچان پرائی تہذیب میں گم ہونے لگی سماجی اور تمدّنی انقلاب ایسے ہی آتے ہیں۔ بارش کے قطرے چشمے پی لیتے ہیں۔ چشمے ندیوں میں مل جاتے ہیں۔ ندیاں دریاؤں میں اور دریا اپنے آپ کو سمُندر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہی قادر کی قُدرت ہے۔ اُن کے جانے کے بعد طاقت اور دہشت کا جنون مزید گہرا ہو گیا۔ لوگ مذہبی جنون اور انتہا پسندی کے غُلام بن گئے۔ عقل کے اندھوں نے ایک دوسرے کے گلے کاٹے۔ پاپی صرف پاپ کے ہوئے نہ مائی کے نہ باپ کے ہوئے۔ گھروں میں روز ماتمی چٹائیاں بچھنے لگیں۔ بارُود کے کھیل میں مکان جلے۔ مندر، مسجد اور خانقاہیں جلیں۔ سنت فقیروں کے حُجرے جلے اور ایک دِن اِس بارُود کے کھیل میں نُند رشی کا مزار بھی جل گیا۔ اُس کا آباد چرار

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بھی جل گیا۔ آگ اور دھوئیں سے ساری دھرتی کالی ہوگئی۔ خیر و برکت سوالی ہوگئی۔ چُپ کے سناٹے نے ستی سر کو گھیر لیا۔ خوشیاں، نصیبے روٹھ گئے۔ رحمت کے دریا سُوکھ گئے۔ دِن ماتم میں ڈُوب گئے اور راتیں درد کے عذاب میں۔ ہر گھر کا سوگ ہر دِل کا روگ بن گیا۔ طاقت اور دہشت نے اپنی بھوک مٹائی۔ لہو کے پیالوں نے راکھشسوں کی پیاس بُجھائی۔

پھر یوں ہوا کہ دو ہیولے مزار کے سیاہ دھوئیں سے باہر نکلے اور دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگئے۔ لوگوں کی آنکھیں اُن ہیولوں کو غائب ہوتے دیکھ کر پتھر ہوگئیں۔ یہ منظر دیکھ کر سادھ سنتوں کی سمادھیاں چیخ اُٹھیں۔ صوفی درویشوں کی قبریں کانپیں۔ ایسے لگا جیسے نُند رشی اپنی دُودھ ماں کو ساتھ لے کر اِس ابھاگن دھرتی کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔ شاید اپنے پُرکھوں کے دیش میں۔ صوفی سنتوں کی دُنیا میں ہلچل مچ گئی۔ سنت اپنے مٹھوں سے اور صوفی درویش کھنڈر ہوئی خانقاہوں سے باہر نکل آئے۔ اُنھوں نے مرگن کے میدان میں مجلس کی اور فیصلہ لیا کہ ماں بیٹے کو واپس لایا جائے تا کہ ظُلم کے خلاف مِل کر لڑائی لڑی جائے اور ستی سر کو آزاد کرایا جائے۔ طاقت اور دہشت کے قہر سے، جنون اور انتہا پسندی کی لعنت سے۔ معصوم بچوں کو جنونی مُلّاؤں اور کٹر پنتھی دھرماتماؤں کی قید سے چُھڑایا جائے۔ اُن کے اندر کی گندگی کو دھویا جائے۔ اُن کو دوبارہ روحانی پاٹھ شالاؤں میں لایا جائے اور گُڑ اور شکر کا شربت پلا کر اُن کے دِلوں اور دماغوں سے نفرت کا زہر باہر نکالا جائے۔ اُنھیں بتایا جائے کہ محبت ہی اِنسانیت ہے۔ محبت صرف محبت کو جنم دیتی ہے جب کہ نفرت حیوانیت کو پیدا کرتی ہے۔ اُنھیں سمجھایا جائے کہ دلیل سے ہی سبیل نکلتی ہے۔ گُمراہ بچوں کو اپنی تہذیب، اپنا ورثہ، اپنی ثقافت اور تمدّن بتایا جائے۔ اُن کے ذہن میں یہ بات ڈالی جائے کہ چناروں اور دیوداروں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کو کاٹ کر چھاؤں نہیں مِل سکتی۔ رشی مُنیوں نے فیصلہ کیا کہ لوگوں کو طاقت کی سرداری اور دہشت کی بیماری سے آزاد کرایا جائے۔ پوری ثابت قدمی اور بے خوفی کے ساتھ اپنی تہذیب اور ثقافت کی کشتی کو ڈوبنے سے بچایا جائے۔ ''مَیں'' کا سر کاٹ دیا جائے اور نجات کے رتھ پر سوار ہو کر دِلوں کی دھڑکنوں کو سکون بخشا جائے تا کہ اِنسانیت کی بیلیں ہری رہیں اور اِس لڑائی کی سربراہی ستی سر کا سورج نند رشی ہی کر سکتا ہے۔ مجلس نے فیصلہ کیا کہ مُرشد کو منانے اور اُسے عزت اور احترام کے ساتھ واپس لانے کے لیے ہری پربت کا چندر ونشی حمزہ مخدُوم اور اُس کی بہن چکریشوری کے علاوہ نند رشی کے چار یار اور مُرید عیش مقام کے رِشی زینہ سنگھ ذین دین، بمّہ زوُہ کے بمّہ سادھ بام دین، ترسر کے رشی وُتر نصر دین اور واڑھون کے رشی لدی رینہ لطیف دین کو بھیجا جائے۔ رِشی مُنیوں کا یہ قافلہ مرگن سے نیچے اُترا اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے چل پڑا۔ بھنڈار کوٹ کے مقام پر چندر بھاگا کے کنارے کھڑے گوردھرن سر کے والی باپ بیٹوں شاہ فرید الدین، شاہ اسرار الدین اور شاہ اخیار الدین نے اِن کا استقبال کیا اور اُنھیں بڑی عزت کے ساتھ چوگان کے میدان میں لائے۔ معرفت اور وحدت کے جام پیے گئے۔ روحانیت کے دستر خوانوں پر دُکھوں کی روٹی، درد کے سالن کے ساتھ کھائی گئی اور خلقت کی خیر و برکت کے لیے دُعا مانگی گئی۔ پھر ستی سر کی تباہی اور بربادی نیز لوگوں کی لاچاری کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ رشی مُنیوں نے بتایا:

''اُن کا مُرشد اپنے جسم پر سات رنگوں کا چولا پہنے گھومتا تھا مگر اُس چولے کو آگ کے شعلوں نے جلا ڈالا۔ راکھشسوں نے نند رشی کو اپنی طرف سے ننگا کر دیا تھا لیکن وہ ننگا نہیں ہوا تھا۔ اُس کے جسم پر پاکی اور قلندری کا لباس تھا جو کوئی بھی نہ اُتار سکا۔ طاقت اور دہشت ستی سر کی شناخت ختم کرنا چاہتی ہے پر ہم ایسا نہیں ہونے دیں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گے۔ ہمیں سُولی پر تو لٹکایا جا سکتا ہے۔ ہمارا سر دھڑ سے تو الگ کیا جا سکتا ہے لیکن سچ اور حق کو جُھکایا نہیں جا سکتا۔ ہم ظاہری عقائد اور سیاسی دستور کے پابند نہیں ہیں۔ ہم مست مولا ہیں۔ ہمارے پاس فقیری کا چولا ہے۔ درویشی کی دولت ہے۔ صوفیوں کی رمز ہے۔ اور ربی عشق کی مستی ہے۔ ہم من کی مالا پر ربی عشق کا وِرد کرتے ہیں۔ ہمارے من روشن ہیں۔ ہمارے اندر محبت کے دیے جلتے ہیں۔ ہم کیسے ''مَیں'' سے ہار سکتے ہیں۔ ہم کشپ پیر کی اولاد ہیں۔ ہم راکھشسوں کے خلاف جنگ جیتیں گے۔ ہم شیطانی طاقتوں کو ختم کر کے دم لیں گے۔ اِس لیے ہم اپنے مُرشد کی تلاش میں آپ کی عملداری میں آئے ہیں۔ ہمیں ہمارا مُرشد ڈھونڈ دیں۔ ہم دردِ چھوڑے سے بے حال ہوئے ہیں۔ ہمارا مُرشد پیارا تلاش کر دیں۔ شاید وہ اپنے اجداد کے مُلک کاٹھوار میں کہیں دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ ہماری مدد کریں۔''

رِشی مُنیوں کی باتیں سُن کر شاہ فرید الدین اور شاہ اسرار حیران ہو گئے اور کہنے لگے، ''بھلا نُند رشی اپنی دُودھ ماں کو لے کر یہاں کیوں آتا؟ اُس کے پاس تو ستی سر کی پادشاہی ہے۔ وہ تو عوام کے دِلوں پر راج کرتا ہے۔ وہ یہاں کیا لینے آئے گا۔ آپ نُند رِشی کو نشاط کے اُن پتھروں میں ڈھونڈو جہاں واسو گپت کو شیو فلسفے کا گیان ملا تھا۔ کھیر بھوانی کے چناروں، مارتنڈ کے مندروں، شاردا مٹھ اور مٹن بھون میں تلاشو۔ ڈل، گنگ بل، مانس بل، وُلر اور کوثر سر کے پانیوں میں ڈھونڈو۔ ویری ناگ اور ناگ بل کے ناگوں سے دریافت کرو۔ بُلبُل شاہ کی کمبلی اور شاہ ہمدان کے کلس میں دیکھو۔ کھیت کھلیانوں اور کیسر کیاریوں میں جاؤ۔ اپنی زبان اور ثقافت میں تلاشو۔ لوک گیتوں اور شلوکوں کی لَے میں محسوس کرو۔ دِلوں کی دھڑکنوں اور سانسوں کی گرماہٹ میں محسوس کرو۔ سیبوں اور باداموں کے باغوں میں جاؤ۔ رنگ برنگے پھولوں کو سونگھو۔ برف

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

پوش چوٹیوں کی خوبصورتی میں تلاش کرو۔ تمہارا مُرشد تمہیں ضرور ملے گا۔''

کاٹھوار کے راجگان کی بات سُن کر رِشی مُنی واپس مُڑے۔ مرگن کے میدان میں ساری خلقت اُن کے سواگت کے لیے کھڑی تھی۔ حق صداقت، پیار محبت، امن، دوستی اور خیر و برکت کے چراغ روشن کیے ہوئے۔ احترام اور عقیدت کے ساتھ مُشکِ بید کی ٹہنیوں کو لہلاتے ہوئے اُن کے بیچ ستی سر کا تاجدار نُند رِشی روحانیت کا پرچم لیے عوام سے مُخاطب تھا۔

''تم لوگ اپنی تہذیب اور ثقافت کو بھول چُکے تھے۔ تم نے حسد اور بُغض کا میلا چولا پہن لیا تھا۔ تم لوگوں کو لالچ، طمع، مکر، فریب اور غرور کا روگ لگ گیا تھا۔ تم کو خُدا بھول چُکا تھا۔ تمہارے ایمان کی گرمی ٹھنڈی پڑ چُکی تھی۔ تمہارے اندر غلاظت کی وجہ سے پوری دھرتی میں بدبو پھیل چُکی تھی۔ تم لوگوں نے جو بویا وہی کاٹا۔ تم نے بِلا شک اپنی پیشانیوں پر تِلک اور محرابیں سجائی تھیں لیکن تمہارا اندرون خراب تھا۔ تمہارے دِلوں اور دِماغوں کی صفائی کے لیے ایک ایسے رنگساز کی ضرورت تھی جو تمہارے کالے ملبوس سفید کر دیتا۔ تم لوگ معرفت کے گیت بھول چُکے تھے۔ تم لوگوں نے عشقِ الٰہی کا سمرن چھوڑ دیا تھا۔ جبھی تو تم لوگ مُصیبت اور ذِلّت کی دلدل میں پھنس گئے۔ کیا مَیں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اگر تم جینا چاہتے ہو تو تمہیں بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک کو سہنا ہوگا۔ کڑی دوپہر میں پھیلی اندھیرے کی چکّی کے پاٹوں میں سے گُزرنا ہوگا۔ جیون کے پربت کا بوجھ اپنے شانوں پر اُٹھانا ہوگا اور ایک ہی لُقمے میں منوں زہر بھی نِگلنا ہوگا۔ پھر تم کیسے طاقت اور دہشت کے جال میں پھنس گئے۔ کیوں تم لوگوں نے ظُلم اور بربریت کے سامنے گُھٹنے ٹیک دیئے؟۔۔۔ لیکن اب تمہارے دِلوں اور دِماغوں سے اِن جنونی پاکھنڈیوں کے جادو کا نشہ اُتر چُکا ہے۔ اب تم لوگوں نے بہت مصیبتیں سہہ لی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہیں۔تم دوزخ کے چولہے میں سُوکھی لکڑی کی طرح جلے ہو۔عذاب کے دِن، ڈر اور وحشت کی طویل راتیں برداشت کر چکے ہو۔تم آگ کا دریا پھلانگ چکے ہو۔تم لوگوں نے طاقت اور دہشت کے سامراج کو رد کر دیا ہے لہٰذا چلو آگے بڑھو اور ''مَیں'' کے خلاف ایک جُٹ ہو کر لڑائی لڑو۔ظُلم کے آتش فشاں کو ٹھنڈا کر دو۔ستی سر کو جنُون، نفرت، پاکھنڈ اور گھمنڈ کی لعنت سے آزاد کراؤ۔اپنی تہذیب اور ثقافت کو بچاؤ۔اپنی روایت کو زندہ رکھنے کے لیے بدی کو فنا کر دو۔''

اور پھر پوری قوم روحانیت کے پرچم تلے متی گاورن کی طرف چل پڑی تا کہ ستی سر کا سارا نجس پانی خادنیار سے باہر نکال دیا جائے۔

----☆----

نوٹ: افسانے میں پیش چند کرداروں اور مقامات سے متعلق وضاحت:-

1. نُند رِشی: چودھویں صدی عیسوی کے مشہور کشمیری درویش اور صوفی شاعر۔پورا نام شیخ نُورالدین ولی۔
2. سلر سین: کشتواڑ کے ہندو راجپوت راجہ اور نُند رِشی کے والد محترم۔
3. للیشوری یاللّہ ماں: شیو یوگنی، شیومت کی پرچارک، کشمیری زبان کی شاعرہ، عظیم روحانی شخصیت، 1324ء میں پانپور، کشمیر میں پیدا ہوئی، نُند رشی کی دُودھ ماں۔
4. حمزہ مخدوم۔چندر ونشی ہندو راجپوت، جو مشرف بہ اِسلام ہوئے۔درگاہ ہری پربت (کشمیر) کے دامن میں ہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

5. چکریشوری۔ ہندو دیوی، جس کا مندر ہری پربت پہاڑی پر ہے۔

6. ستی سر۔ کشمیر کا پُرانا نام۔

7. کشپ پیر۔ وہ رِشی جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اُس نے کشمیر کی جھیل کا پانی بارہ مولہ کے مقام خادن یار (پہاڑی کو کاٹ کر) سے باہر نِکالا تھا اور آبادی بسائی تھی۔

8. چندر بھاگا۔ دریائے چناب کا پُرانا نام۔

9. مرگن۔ پیر پنچال سلسلے کا وہ پہاڑ، جس کے ایک طرف ضلع کشتواڑ ہے اور دوسری طرف وادی کشمیر۔

10. گوردھن سر اور کاٹھور۔ کشتواڑ کے پُرانے نام۔

11. شاردا پیٹھ۔ کشمیر کی پُرانے زمانے کی یونیورسٹی۔ شاردا ٹیٹوال کے سامنے اور دریائے کشن گنگا (نیلم) کے پار ہے اور اِس علاقے کو تحصیل کا درجہ مِلا ہے، جو نیلم ضلع کا حصہ ہے۔

12. مارتنڈ، مٹن بھون، کھیر بھوانی۔ کشمیری پنڈتوں کے تاریخی متبرک مندر اور مقامات۔

13. متی گاؤرن۔ مرگن کی دوسری جانب انت ناگ ضلع کا پہلا گاؤں۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

لکیر

بھارت اور پاکستان کے رشتوں کے بارے میں یہ محاورہ پوری طرح صادق آتا ہے کہ لوہار کی سانسی کبھی آگ میں اور کبھی پانی میں۔ ایسے رشتوں کے باوجود بھی دونوں حکومتوں کا یہ فیصلہ قابلِ ستائش تھا کہ کشمیر کے دونوں اطراف بسنے والے لوگوں کو آپس میں ملنے دیا جائے۔ اِسی فیصلے کی رُو سے پاکستانی انتظام والے کشمیر میں جانے کے لیے مجھے اور میری بیگم کو ریاستی سرکار کی طرف سے پروانگی اور روانگی پرمٹ ملا تھا۔ مقررشُدہ تاریخ کو جو بس سرینگر سے مظفرآباد جانی تھی اُس میں ابھی دس بارہ دِن باقی تھے۔ مجھے ملیٹنٹوں کی جانب سے قتل کی دھمکیاں بھی ملی تھیں پر مَیں نے اپنا ارادہ نہیں بدلا اور کشمیر کے اُس طرف بسنے والے اپنے رشتہ داروں کے لیے تُحفے تحائف خریدنے میں مصروف رہا۔ ہم دونوں میاں بیوی خوش تھے۔ میری بیگم نسیم کے پھوپھی زاد بھائی بہنیں اور موسیاں میرپور، راولپنڈی، اسلام آباد، لاہور اور سیالکوٹ میں رہتی ہیں جن سے مُلاقات کرنے ہم نصف صدی کے بعد جا رہے تھے۔ بھارت اور پاکستان کے نجی اور سرکاری ٹیلیویژن چینل ہمارے اور ہمارے رشتے داروں کے اِنٹرویو دِکھا رہے تھے اور اخباریں ہمارے متعلق سُرخیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ یوں دِن گُزرتے گئے اور پھر پانچ اپریل 2005ء کا وہ دِن بھی قریب آ گیا، جب ہمیں جموں سے سرینگر کے لیے روانہ ہونا تھا تاکہ سات اپریل کو سرینگر سے مظفرآباد جانے والی پہلی بس میں سوار ہو

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سکیں۔ یہ ایک تاریخی فیصلہ تھا جو شاید امریکی دباؤ کے کارن بھارت اور پاکستان کی سرکاروں نے لیا تھا اور جس کے لیے اٹل بہاری واجپائی، ڈاکٹر منموہن سنگھ اور جنرل مشرف کی ہر طرف سے تعریف ہو رہی تھی۔

ہماری تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ ہم کل صبح سرینگر جانے کے لیے بالکل تیار تھے کہ دیر رات گئے ایک بزرگ مُجھ سے ملنے آیا اور کہنے لگا:

''مَیں نے تمہارے ساتھ کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' مَیں نے اُس بزرگ شخص کو عزت و احترام کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا اور کہا:

''فرمائیں بابا جی، کیا بات کرنی ہے۔''

''مَیں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں لوگوں سے تمہاری بیٹھک بھری ہوئی ہے۔''

مَیں اُس بزرگ کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اُس کی عمر اسّی سال سے زیادہ ہو گی لیکن وہ صحتمند دِکھائی دے رہا تھا۔ لمبا، خوبصورت اور مظبوط جسم کا مالک۔ ہم دونوں کمرے میں بچھی قالین پر بیٹھ گئے۔ مَیں نے دیسی نمکین چائے منگوائی اور پھر بزرگ سے کہا:

''بابا! حُکم کرو۔ مَیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''بیٹا! مَیں نے تم کو دو تین بار ٹیلی ویژن چینلوں پر دیکھا ہے۔ مجھے معلوم پڑا ہے کہ تم کشمیر کے دوسرے حصے میں جا رہے ہو جہاں میری صابری رہتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر جانے کیوں مجھے یہ یقین ہونے لگا کہ تم میرا کام ضرور کرو گے اور مجھے مایوس نہیں کرو گے۔''

''بابا جی آپ فرمائیں، مجھے خوشی ہو گی اگر مَیں آپ کے کام آسکوں۔'' میرا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جواب سُن کر اُس بزرگ شخص کے چہرے پر رونق آ گئی اور پھر اُس نے کہنا شروع کیا:

''بیٹا! میرا نام سجاول چودھری ہے۔ مَیں تحصیل باغ، ریاست پونچھ کا رہنے والا ہوں۔ میرا گاؤں بھوٹ بھائیاں کے پاس تھا۔ ملک کی تقسیم اور پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی مجھ پر دُکھوں اور مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ غم کے نشتروں نے میرا سینہ چھلنی کر دیا۔ دِل کے زخموں نے بہت تڑپایا مگر مَیں کچھ نہ کر سکا اور وقت کے ہاتھوں بے بس ہو گیا۔''

''بابا جی! بات جلدی ختم کریں۔ مجھے ملنے کے لیے کئی دوست احباب آئے ہیں اور مَیں نے اُن سے بھی باتیں کرنی ہیں اور صبح سرینگر کے لیے سفر کا آغاز بھی کرنا ہے۔''

''اچھا بیٹا اچھا، مَیں اپنی بات جلد ختم کرنے کی کوشش کروں گا لیکن تم غور سے سنو اور میری مدد کرو۔ اللہ تمہیں اِس کا اجر دے گا۔ بیٹا! مَیں بھوٹ بھائیاں کے نمبردار چودھری سراج دین کے گھر چاکری کرتا تھا۔ مال مویشی پالنا، بھیڑ بکریاں چرانا، گائے بھینسوں کا دُودھ دھونا، جنگل سے لکڑی لانا، پھلدار باغات میں دوائیاں چھڑکنا، پن چکی سے مکئی، گندم اور دھان پِسوا کر لانا، چشمے سے پانی بھرنا، میرے روز کے کام تھے۔ پھر رات کو چودھری سراج دین کے پاؤں دبانا۔۔۔ میرا باپ بچپن میں ہی فوت ہو گیا تھا اور ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ میرا سوتیلا باپ مجھے بات بات پر مارتا، پیٹتا اور گالیاں بکتا۔ آخر تنگ آ کر مَیں گھر سے بھاگ نِکلا اور چودھری سراج کے پاس آ گیا۔ اُس نے مجھے آسرا دیا اور اپنا نوکر رکھ لیا۔ صاف سُتھری غذا، خالص دُودھ، دہی اور مکھن کھانے سے میرا جسم توانا بنتا گیا۔ اُس پر جوانی کے شگوفے کِھلنے لگے۔ مَیں موقع ملتے ہی گاؤں کے اکھاڑے میں جاتا۔ ڈنڈ پیلتا، پہلوانوں کے ساتھ زور آزمائی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کرتا اور داؤ سیکھتا۔ میرے بازوؤں اور رانوں کی مچھلیاں اور چوڑی چھاتی دیکھ کر الہڑ دوشیزائیں مجھے رِجھانے کی کوشش کرتیں۔ اِن کی بے ہدایت آنکھیں مجھے بہکانے کا جتن کرتیں۔ مَیں جان بوجھ کر انجان بن جاتا اور اپنا بھولا پن نہیں چھوڑتا لیکن ایک گاجر رنگ کی مٹیار میرے پیچھے پڑ گئی۔ مَیں نے اُس سے پیچھا چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر اُس شرم سڑھی کو عشق کا بُخار چڑھا ہوا تھا۔ اُس کا نام صابری تھا اور وہ چودھری سراج کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اُس جیسی نین نقش والی دوشیزہ لاکھوں میں کوئی ایک ہوگی پر مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ مَیں نمبردار کی عزت پر ہاتھ ڈالوں۔ مَیں چودھری سراج کے احسانوں تلے دبا ہوا تھا۔ میرے پاس اپنا کچھ بھی نہیں تھا۔ میرے نصیب کی پٹاری میں غُربت کا سانپ کُنڈلی مار کے بیٹھا ہوا تھا لیکن حق بات یہ ہے کہ صابری مجھے چاہنے لگی تھی۔ مَیں اُس سے جتنا دُور بھاگتا وہ اتنا ہی میرے قریب آتی جاتی۔

لڑکیاں بیل کی مانند ہوتی ہیں جن کو بڑھتے دیر نہیں لگتی۔ جبھی تو ماں باپ کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب اُنھوں نے جوانی کی دہلیز پار کر لی ہے اور کب عشق کا شہد چاٹ لیا ہے۔

صابری کے حُسن کی بہار دیکھ کر اُس کے لیے شادی کے پیغام آنے لگے۔ چودھری کی آنکھیں کُھلیں اور وہ بھی صابری کے لیے کوئی آسودہ اور شریف گھر کا لڑکا تلاش کرنے لگا۔

مَیں چودھری سراج کا نمک حلال تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ عشق کی مُشک حویلی کے باہر پھیلے۔ ایک دِن مَیں جب چودھری کی ٹانگیں دبا رہا تھا تو اُس نے حُقّہ تازہ کرنے کے لیے کہا۔ مَیں نے حُقّے میں تازہ پانی ڈالا۔ چلم میں تمباکو بھرا۔ چولہے سے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جلتے کوئلے چلم میں رکھے اور حُقّہ چودھری کے سامنے رکھ دیا۔ وہ حُقّے کے کش لینے لگا اور مستی میں سیف الملوک گانے لگا۔ مَیں نے موقع غنیمت جانا اور آہستہ سے کہا:

''سرکار! مَیں اپنی پن چکّی لگانا چاہتا ہوں۔ صبح و شام آپ کی خدمت کروں گا اور دِن کو پن چکی چلاؤں گا۔ ویسے تو آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہے لیکن مَیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو مَیں جنگل کے پاس والی ندی پر پن چکّی لگاؤں گا۔ صبح گھر کا سارا کام ختم کر کے مال مویشی لے جاؤں گا، پن چکّی بھی چلاؤں گا اور مویشی بھی چرا کر لاؤں گا۔'' چودھری نے مجھے اجازت دے دی۔ مَیں پن چکّی چلانے لگا۔ مَیں نے سوچا تھا کہ اِس طرح صابری سے میرا پیچھا چھوٹ جائے گا مگر مَیں غلطی پر تھا۔ صابری شِکرے باز کی آنکھ رکھتی تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ روز سیر کرنے کے بہانے پن چکّی کی طرف آجاتی۔ وہ سب مل کر گیت گاتیں، ماہیے سُناتیں اور مجھ پر ڈورے ڈالتیں۔ مَیں شروع میں جھجکتا رہا، شرماتا رہا پھر آخر مَیں نے اپنے من کے کواڑ کھول دیے اور صابری چپکے سے میرے دِل کی کُٹیا میں داخل ہوگئی اور پیار کی برسات میں مجھے بھگو گئی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ پانی بڑا من موجی ہوتا ہے۔ اِس کا جی کرے تو تیراکوں کو ڈبو دیتا ہے اور چاہے تو ڈوبتوں کو کنارے لگا دیتا ہے۔ خُدا جانے کہ مَیں ڈوبا تھا یا پار اُترا تھا لیکن صاف بات یہ ہے کہ پانی اگر آگ کے پاس رہے گا تو اُس میں کبھی نہ کبھی اُبال آ ہی جاتا ہے۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب عشق کا ناگ اُبلتے پانی میں سے نِکلا اور مجھے ڈنک مار گیا۔ مَیں نے بھی رانجھے یار کی طرح ونجلی پکڑ لی اور صابری کے پیار بھرے گیتوں کا حصّہ بن گیا۔ ہم روز ملنے لگے۔ اِس عشق چندرے نے ہمارے انگ انگ میں مستی کے جھولے سجا دیئے اور مَیں نے اپنی نیندیں صابری کے نام کر دیں۔ وہ روز دِن چڑھے میرے پاس آتی اور

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

مجھے اپنے ہاتھوں سے چُوری کھلاتی اور مَیں اُسے پیار کے رس گُلّے کھلاتا۔ ہم ہنستے، کھیلتے، سیف الملوک گاتے۔ دھیرے دھیرے ہمارے عشق کے تاپ کی تپش صابری کے والدین تک پہنچنے لگی۔ اِس سے پہلے کہ یہ تپش اُن کو جلا دیتی وہ صابری کے لیے دُلہا ڈھونڈنے لگے۔ رشتے آنے لگے۔ پوچھ تاچھ ہونے لگی۔ ایک آدھ جگہ بات آگے بڑھنے لگی۔ مَیں چُپ تھا کیوں کہ نوکر تو ہمیشہ مالک کے سامنے گونگا ہوتا ہے لیکن صابری نے حوصلہ کر کے اپنی ماں سے کہا:

''مَیں سجاول کو چاہتی ہوں۔ وہ میرا انجھا جوگی ہے اور مَیں اُس کی جوگن۔ ہماری جوڑی بہت جچتی ہے۔ مَیں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ آپ باہر تانکنا جھانکنا بند کریں۔ جب گھر میں لڑکا ہے تو باہر ڈھونڈنے کا کیا مقصد۔ ہماری شادی کرا دو۔ مَیں آپ کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ سجاول ہمارے گھر میں ہی رہے گا اور ساری عمر آپ کی خدمت کرے گا۔ اُس کا آپ کے سِوا اور کوئی نہیں ہے۔ وہ یہاں ہی پلا بڑھا ہے اور یہاں ہی اپنی گرہستی بنائے گا۔ امّاں تُو ابّا کو سمجھا۔''

صابری کی باتیں سُن کر اُس کی ماں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی اور کہنے لگی:

''صابری! چودھری کو قہر چڑھا ہوا ہے۔ وہ سجاول کے ٹکڑے کر دے گا۔ سجاول کے ساتھ تمہاری شادی کی بات سوچی بھی نہیں جا سکتی۔ گاؤں کے نمبردار کی بیٹی کی شادی ایک نوکر کے ساتھ۔ یہ ناممکن ہے۔ اُس کے پاس ہے ہی کیا۔ وہ تمہیں کہاں سے کھلائے گا۔ صابری! تنکوں سے گھونسلے تو بنتے ہیں لیکن گھر نہیں بنتے۔ تم پر سجاول نے جادو کر دیا ہے۔ اِسی لیے تم یہ بکواس کر رہی ہو۔''

''امّاں سُن! جھوٹ کو پھٹکار اور سچ کو ستکار۔ اِس لیے اپنی اور ہماری عزت بچا۔ اِسے داغ نہ لگنے دے۔'' پر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ایک دِن جب گھر میں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بتاشوں کے ٹوکرے آئے تو صابری نے ہونے والے سمبندھوں کو آری سے کاٹنے کا فیصلہ کرلیا۔ آدھی رات کے وقت وہ بے خوف ہو کے میرے پاس آئی اور کہنے لگی:

''چلو یہاں سے بھاگ چلیں۔ میرے ماں باپ نہیں مانتے۔ اِس لیے چلو وہاں چلیں، جہاں کوئی دھرم ہو نہ حسب ونسب، نہ جبر ہو نہ قہر، دہشت ہو نہ وحشت۔ چلو وہاں چل کر گھر بسائیں۔''

مَیں نے بڑا سمجھایا۔ اُسے یہ انتہائی قدم اُٹھانے سے منع کیا لیکن اُس نے ایک نہ سُنی۔ ہم اُسی رات وہاں سے نِکل پڑے۔ میدانی اور پہاڑی سفر کرنے لگے۔ ندی، نالے، دریا پھلانگنے لگے اور آخر راجوری کے گاؤں ساج میں آ گئے۔ ہم دونوں نے نِکاح کرلیا۔ مَیں نے ساج ندی پر ہی اپنی پن چکّی لگالی اور گندم، مکئی اور دھان پیسنے لگا اور رزق کمانے لگا۔ مَیں صابری کا پورا خیال رکھتا۔ اُس کی ہر خواہش پورا کرنے کی کوشش کرتا کیوں کہ اُس نے اپنے سارے سپنے میرے نام کر دیے تھے۔ ہم دونوں خوش تھے۔ ہم نے ایک چھوٹا سا کچا گھر بھی بنالیا۔ پانچ سالوں کے اندر اندر ہمارے آنگن میں سانول اور نفیسہ کھیلنے لگے۔ مَیں ڈٹ کر محنت کرنے لگا۔ مَیں نے پن چکّی کے ساتھ ہی ایک کریانے کی دوکان بھی کھول لی جہاں دیہاتی بھائی شہد، راجماش، دیسی گھی، گیزا چاول اور گچھیاں فروخت کرنے کے لیے لاتے اور بدلے میں ضرورت کی چیزیں خرید کر لے جاتے۔ ہم اپنی چھوٹی سی دُنیا میں خوش تھے۔

ایک دِن راجوری کے بازار گوجر منڈی کی ایک بڑی دوکان سے سودا خرید کر مَیں باہر نِکلا ہی تھا کہ چودھری سراج دین کے لنگوٹیے یار سردار اُتم سنگھ نے مجھے دیکھ لیا۔ مَیں نے آنکھیں چُرانے کی بڑی کوشش کی لیکن بے کار۔ اُس نے مجھے دبوچ لیا اور صابری کے بارے میں پوچھنے لگا۔ مَیں اُسے اپنے گھر لے آیا۔ چاچے اُتم سنگھ کو دیکھ کر

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

صابری خوشی سے پاگل ہوگئی اور دوڑ کر اُس کے گلے لگ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔ چاچا اُتم سنگھ اُسے چُپ کراتا رہا لیکن آنکھوں کا سیلاب کنارے توڑ کر بہہ رہا تھا۔ چاچا اُتم سنگھ بھی کافی دیر تک ہچکیاں لیتا رہا۔ آخر دِل کا غُبار نِکلا تو صابری نے اپنے دونوں بچوں کو چاچے اُتم سنگھ سے ملایا۔ پھر صابری چائے بنا کر لے آئی۔ سب نے مل کر چائے پی۔ اُس نے میرے اور اپنے بارے میں سردار چاچے کو تفصیل کے ساتھ بتایا اور پھر اپنی ماں اور ابّو کے بارے میں پوچھا۔

''بیٹی! تم نے گھر سے بھاگ کر اُن پر بڑا ظُلم کیا۔ تم چودھری سراج دین کے گھر کا روشن چراغ تھی۔ اُس کی عزت کی دستار۔ تمہارے ماں باپ نے تمہیں بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا لیکن تم سجاول کے پیار میں اندھی ہو کر گھر سے بھاگ نِکلی۔ تم نے باپ کی عزت کا گُلدان بیچ چوراہے توڑ دیا۔ جب چودھری کو پتہ جلا تو اُس نے اپنی دونالی نکالی اور سجاول کو مارنے کے لیے نکل پڑا۔ اُس کے ساتھ اُس کے گُرگے بھی تھے۔ کسی نے درانتی پکڑی، کسی نے برچھا تو کسی نے تلوار۔ جس کے ہاتھ جو ہتھیار آیا اُس نے وہ اُٹھایا اور چودھری کے ساتھ چل پڑا۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی گئی۔ سب نے مل کر تلاش شروع کی۔ جگہ جگہ چھاپے، مارے گئے مگر تم لوگ نہ جانے کہاں چھُپے تھے کہ کسی کے ہاتھ نہ آئے۔

آخر چودھری تھک ہار کر اپنی حویلی میں قید ہو گیا اور اپنا دُکھ درد آنسوؤں کی زبان میں بیان کرنے لگا۔ اُس کے دِل کے زخموں پر مرہم لگانے والا کوئی نہیں تھا۔ بدنامی اور شرمندگی نے اُس کی ساری خوشیاں نچوڑ لی تھیں۔ اِس حادثے نے اُس کی روح کے تاروں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تمہاری وجہ سے شریکوں نے ڈھول بجائے اور تہمتیں لگانے لگے۔ رِشتے دار دِل کی بھڑاس نکالنے لگے۔ ہر ایرا غیرا نمبردار کی پگڑی اُچھالتا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

تمہاری ماں بھی دِن رات روتی رہتی۔ تم نے اُس کی نیندیں حرام کر دیں تھیں۔ اس کی آنکھیں صرف تمہیں تلاش کرتیں۔ تم دونوں نے اُن کی خوش بختی پر جھاڑو پھیر دیا تھا۔ مَیں چودھری کا دوست تھا لیکن مَیں بھی کچھ نہ کر سکا۔ وہ ذِلّت اور بدنامی کے کنویں میں ڈوب گیا۔ اُس نے اپنی زندگی کو موت کا پھندہ لگا لیا۔ حویلی ویران ہوگئی۔ تمہاری ماں کی دُنیا اُجڑ گئی۔ وہ کبھی چودھری کو اور کبھی تمہیں یاد کر کے روتی رہتی ہے۔''

''سردار چاچا! اگر ہمیں ابُو جی کی وفات کا پتہ چلتا تو ہم ضرور گھر جاتے۔ کم از کم اُن کی قبر پر مٹی ڈالتے اور فاتحہ پڑھتے۔ ماں کے غم میں شریک ہوتے۔ مگر ہمیں کیسے پتہ چلتا۔ ہم نے کب کسی کو بتایا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ مَیں نے اپنے وجود کو اپنے ماں باپ کے وجود سے الگ کر لیا تھا لیکن وہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے وجود سے الگ نہیں کر سکے اور جُدائی کی بھٹی میں جل کر راکھ ہو گئے۔''

''سردار چاچا! تمہاری دستار اُونچی رہے۔ مجھے میری ماں کے پاس لے چلو۔ وہ اکیلی رہ گئی ہے۔ اُس کا دُکھ بانٹنے والا وہاں کوئی نہیں ہے۔ مَیں کچھ دِن اُس کے پاس رہوں گی اور ہوسکا تو اُسے ساتھ لے کر آؤں گی۔ اُس کا وہاں اب کون ہے۔ سردار چاچا! مَیں تمہاری بھی بیٹی ہوں۔ میری روح تڑپ رہی ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے چل۔'' پھر اُس نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی:

''سجاول! کیا ہم گاؤں نہیں جا سکتے؟ کیا ہم اپنے گھر میں نہیں رہ سکتے؟ وہاں رہ کر ہم ماں کی خدمت کریں گے۔ تم ابُو کا کام کاج سنبھالنا۔'' مَیں نے صابری کو سمجھایا کہ میرے لیے وہاں حالات سازگار نہیں ہیں اور پھر اللہ کا دیا یہاں سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ کاروبار اچھا چل رہا ہے۔ سانول انگریزی سکول میں پڑھنے لگا ہے۔ اگلے سال نفیسہ بھی سکول جانے لگے گی۔ اِس لیے بچوں کے مستقبل کے لیے مَیں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

یہاں ہی رہوں گا۔ مَیں خود تو نہ گیا مگر صابری کو سردار چاچے کے ہمراہ جانے کی اجازت دے دی۔ جاتی بار مَیں نے سردار اُتم سنگھ سے کہا کہ مَیں صرف تمہارے بھروسے صابری کو گاؤں بھیج رہا ہوں۔ وعدہ کرو کہ تم میری امانت خود مجھے لوٹانے آؤ گے۔ اُس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کے یقین دلایا اور کہا:

''بیٹا! مَیں واہیگورُو سچے پادشاہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ صابری کو ماں سے ملانے کے بعد واپس لے کر آؤں گا اور تمہاری امانت تمہارے حوالے کر کے جاؤں گا۔ یہ گورُو کے سِکھ کی زبان ہے اور سِکھ اپنا وچن کبھی نہیں توڑتا۔'' اور یوں صابری سردار چاچے کے ساتھ اپنے گاؤں چلی گئی۔ سانول اور نفیسہ میرے پاس ہی رہے۔ صابری کے جانے کے کچھ دِنوں بعد ملک تقسیم ہو گیا۔ کُشت وخون کی ایک آندھی چلی۔ قبائلی حملہ ہوا۔ بھارتی فوجیں ریاست میں داخل ہوئیں، قبائلیوں کو ریاست سے باہر کھدیڑنے کے لیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت کے ساتھ ساتھ جموں وکشمیر کی ریاست بھی تقسیم ہو گئی۔ صابری بھوٹ بھائیاں میں رہ گئی اور اُس کا سجاول راجوری میں۔ اُس کے جانے کے بعد مَیں جُدائی کی آگ میں جلتا رہا لیکن اپنے فرائض کو نبھاتا رہا۔ مَیں نے بڑی محنت کی۔ سانول اور نفیسہ کو پڑھایا۔ راجوری میں آٹے کی ایک بڑی مِل لگائی۔ سانول اور نفیسہ کی شادیاں کیں۔ آج مَیں پوتے پوتیوں والا ہوں۔ سانول مِل کا سارا کام سنبھال رہا ہے۔ دِن بڑے اچھے گزر رہے ہیں، پر میری روح بے چین ہے۔ اُسے ایک پل بھی سکون نہیں ملا۔ وہ صابری کو ملنے کے لیے تڑپتی ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کیا خبر کہ کب روح جسم کی قید سے آزاد ہو جائے۔ اِس لیے بیٹا! مَیں تیرے پاس یہ فریاد لے کر آیا ہوں کہ تم صابری کا پتہ لگانا کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی۔ اگر زندہ ہے تو کہاں ہے۔ مَیں بیٹا! مرنے سے پہلے صابری کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اِس لیے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

میری مدد کرو۔"

سجاول بابا کی کہانی سُن کر مَیں بڑا دُکھی ہوا۔ مَیں نے اُسے بھروسہ دلایا کہ مظفر آباد پہنچتے ہی مَیں سب سے پہلے اماں صابری کو تلاش کروں گا۔ اُس سے مُلاقات کر کے تُمہاری آپ بیتی سُناؤں گا اور واپسی پر انشاء اللہ تُم کو ساری جانکاری دوں گا۔"

بابا مجھے دُعائیں دیتا ہوا چلا گیا اور مَیں سوچنے لگا کہ مُلک کی تقسیم کی وجہ سے لاکھوں خاندان اُجڑے۔ لاکھوں موت کا نوالہ بنے۔ مَیں من ہی من میں تقسیم کے لیے ذمہ دار سیاست دانوں اور مذہبی جنونیوں کو کوستا رہا۔ ساری رات گہما گہمی رہی۔ یار بیلی اور رشتہ دار آتے جاتے رہے۔ چائے، قہوہ چلتا رہا۔ صبح ہم دونوں سرینگر کے لیے روانہ ہوئے اور شام کو وہاں پہنچ گئے۔ رات مَیں نے اپنے دوست جناب تاج محی الدین کے گھر گُزاری جو سیکورٹی زون میں رہتا ہے۔ سات اپریل 2005ء کو دیش کے پردھان منتری اور اُن کے ساتھ آئے مرکزی وُزرا اور ریاستی وزیرِ اعلیٰ نے ہمیں پولوگراؤنڈ سرینگر سے اِس تاریخی سفر کے لیے روانہ کیا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اُوڑی میں کھایا۔ پھر کاروانِ امن بس کمان پُل کی جانب چل پڑی۔ کسٹم والوں نے ہمارے پرمٹ چیک کیے، شناختی کارڈ دیکھے، سامان کی تلاشی لی اور ہمیں چکوٹی جانے کی اجازت دے دی۔ کمان پُل کے دوسری جانب پاک فوج کے افسروں، مظفر آباد ڈویژن کے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر نے ہمارا استقبال کیا۔ جب کہ چکوٹی میں پاکستان کے انتظام والے کشمیر کے وزیرِ اعظم اور دوسرے وُزرا اور اعلیٰ افسروں نے ہمارا سواگت کیا۔ رات ہم نے مظفر آباد میں گُزاری اور دوسرے دِن سبھی اپنے اپنے رشتے داروں سے ملنے چلے گئے۔ ہمیں لینے کے لیے میر پور سے عاشق بھائی آئے تھے۔ دو دِن میر پور میں رہنے کے بعد مَیں بھوٹ بھائیاں چلا گیا اور پتہ پوچھتے پوچھتے چودھری سراج کے گھر پہنچ گیا۔ مَیں اماں صابری

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سے ملا۔ وہ مجھے مل کر بہت خوش ہوئی۔ مَیں نے اُس کے ساتھ باتیں کیں۔ سجاول کے متعلق، سانول اور نفیسہ کے بارے میں۔ مَیں نے بتایا کہ سجاول بابا کی آنکھوں میں تمہیں ملنے کی تڑپ ابھی بھی تازہ ہے۔ امّاں صابری میری باتیں سُنتی رہی اور روتی رہی۔ اُس کی آواز میں درد تھا اور آنکھوں میں اُداسی۔ وہ کہنے لگی:

''سجاول نے تو اپنا دُکھ بیان کر دیا، لیکن میری داستانِ غم کا اُسے کیسے پتہ چلتا۔ بیٹا! مَیں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح سجاول کے پاس جا سکوں۔ بچوں سے مل سکوں لیکن سرحدوں کی کانٹے دار تار نے میری روح کو لہولہان کر دیا۔ پھر بھی رب سچے کو میری حالت پر ترس نہیں آیا۔'' امّاں صابری نے میرے سامنے دُودھ کا گلاس رکھا اور اپنی آپ بیتی سُنانے لگی:

''چاچے اُتم سنگھ کے ساتھ جب مَیں اپنے گاؤں آئی تو دونوں ماں بیٹی نے خوب نیر بہائے اور دُکھ سانجھے کیے۔ امّاں نے مجھے کوستے ہوئے کہا، ''ہماری صرف کہانی رہ گئی۔ اکیلی جان فانی رہ گئی۔ تمہاری دید کو آنکھ سوالی ہو گئی۔ آس کی ہانڈی خالی ہو گئی۔ میرے دُکھوں کی ناؤ درد کی لہروں میں ڈولتی رہتی۔ جانور بھی اپنے گھر کا راستہ نہیں بھولتا لیکن تم تو سب کو بھول گئی۔ ماں، باپ، گھر اور گاؤں کا دُلار سب کچھ۔ تیرے بغیر خالی حویلی میں ہنسی کے پھوارے خشک ہو گئے لیکن وقت جُدائی کے زخموں کے لیے سب سے بڑی مرہم ہوتا ہے۔'' پھر اُس نے مجھے گلے لگا لیا اور مجھے چومنے لگی۔ بے چین روحوں کو سکون ملا۔ پھر مَیں نے سجاول، سانول، اور نفیسہ کے بارے میں جانکاری دی اور بتایا کہ ہم راجوری میں سُکھی جیون گُزار رہے ہیں۔ سجاول مجھ اور بچوں کو بہت پیار کرتا ہے۔ گھر کی ساری ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ ہمیں کسی چیز کی محتاجی نہیں ہے۔ داتا کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ گاؤں والے، رشتہ دار اور میری

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سہیلیاں سب مجھے ملنے کے لیے آئے۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ دس بارہ ایام کیسے گزر گئے۔ ایک دِن چاچا اُتم سنگھ ہمارے گھر آیا۔ اور کہنے لگا کہ قبائلی جتھے ریاست میں داخل ہو گئے ہیں۔ ریاستی فوجیں بھاگ گئی ہیں۔ مہاراجہ سرینگر سے جموں چلا گیا ہے اور قبائلیوں نے قہر مچایا ہوا ہے۔ وہ لوگوں کا قتلِ عام کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے لوٹ مار مچا رکھی ہے۔'' دو چار دِنوں بعد چاچا اُتم سنگھ دوبارہ آیا اور کہنے لگا:

مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کر لیا ہے اور بھارتی فوجیں قبائلیوں کو کھدیڑنے کے لیے ریاست میں داخل ہو گئی ہیں۔ زوردار لڑائی ہو رہی ہے۔ کئی علاقوں سے قبائلی پسپا ہو رہے ہیں۔ اُس نے مجھے تیار ہونے کے لیے کہا تا کہ وہ سجاول کی امانت اُس کے پاس پہنچا سکے اور اپنا وعدہ نبھا سکے۔ اُس نے کہا:

''یہ سب بھارت کی تقسیم اور پاکستان نام کا ایک نیا مُلک بن جانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ فرقہ دارانہ فساد ہو رہے ہیں۔ اِنسان ہندو، مُسلمان اور سِکھ کے نام پر مارے جا رہے ہیں۔ فرقہ دارانہ آگ کے شُعلے یہاں بھی بھڑک رہے ہیں۔ خُدا جانے کیا بنے گا۔ اِس لیے تم تیار ہو جاؤ۔ ہم صبح راجوری کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔''

مَیں نے امّاں کو ساتھ چلنے کے لیے بہت زور لگایا لیکن وہ نہ مانی۔ وہ اپنا گھر چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ دوسری صبح چاچا اُتم سنگھ گھوڑے لے کر آ گیا۔ امّاں نے روتے بِلکتے مجھے رُخصت کیا۔ میری آنکھوں سے بھی سیلاب بہہ رہا تھا۔ ہم مدار پور کے راستے بلنوئی پہنچے۔ وہاں رات گُزاری۔ دوسرے دِن سورج نکلنے سے پہلے ہم وہاں سے چل پڑے۔ ابھی مینڈھر کے نزدیک سخی میدان ہی پہنچے تھے کہ پٹھان بلوائیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ایک بلوائی جب میری طرف بڑھنے لگا تو چاچے اُتم سنگھ نے اُسے للکارا اور تلوار نکال لی۔ مگر بلوائیوں کے پاس بندوقیں تھیں۔ چاچے نے بڑی دلیری کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ساتھ مقابلہ کیا لیکن تلوار بندوق کا مقابلہ نہ کرسکی۔ چاچا اُتم سنگھ شہید ہوگیا، میری لاج بچاتے بچاتے اور اپنا وچن نبھاتے نبھاتے۔ عزّت، شرافت اور صداقت کا ستون ڈھے گیا۔ بلوائیوں نے مجھے اغوا کرلیا۔ اور مالِ غنیمت کی تقسیم میں مجھے کرامت خان کے حوالے کر دیا۔ جو مجھ جنم جلی کو اپنے علاقے بالاکوٹ لے گیا۔ مَیں نے اُسے اپنی زندگی کا سچ سُنایا مگر اُسے مجھ پر رحم نہیں آیا۔ میرا درد دُگنا ہوگیا پر مَیں کچھ نہ کرسکی۔ صِرف اپنی تقدیر کو بد دعائیں دیتی رہی۔ مَیں بے بس ہوگئی۔ مَیں جانتی تھی کہ بھیڑ جہاں بھی جائے گی کُتری جائے گی۔ سو کرامت بھیڑ کی اُون کترنے لگا۔ وہ حرامی بڑا ظالم تھا۔ اُس نے مجھے دو برس تک قید رکھا۔ پھر یوں ہوا کہ میرے صبر نے اُس کے ظُلم پر فتح حاصل کی۔ ایک نیک عورت کی وساطت سے مَیں وہاں سے بھاگ نکلی اور اپنے گاؤں امّاں کے پاس آگئی۔ امّاں میرا دُکھ برداشت نہ کرسکی۔ وہ بیمار رہنے لگی۔ وہ ہڈیوں کا پنجر بن گئی اور آخر ختم ہوگئی۔ مَیں اکیلی رہ گئی۔ وقت پَر لگا کے اُڑنے لگا۔ میرے اندر کے سمندر میں بے شُمار بھنور تھے۔ امّاں، سجاول، سانول اور نفیسہ سب اِس بھنور میں گردش کرتے رہتے۔ مَیں نے کئی بار موت کو گلے لگانے کی کوشش کی لیکن زندگی نے مجھے مرنے نہیں دیا۔ مَیں نے دُعائیں مانگنی چھوڑ دیں کیوں کہ دُعائیں قبول ہونے کی صِفت بھول چُکی تھیں۔ پر بیٹا! میرے ہاتھوں پر جُدائی کی مہندی بڑی گہری ہے۔ یہ ابھی تک پھیکی نہیں پڑی اور سجاول میری حقیقت ہے، میری محبت، میری عبادت۔ میرے دِل نے سدا اُس کے نام کا ہی وِرد کیا ہے۔ اب اُداسی اور دَرد کے ایک لمبے موسم کے بعد تم پہلی بار پھولوں کی خوشبو کی طرح آئے ہو۔ میرے خوابوں کی تعبیر بن کر آئے ہو۔ مَیں کنویں کی دیوار پر اُگا ایک ایسا پیپل ہوں جس کی کوئی پوجا نہیں کرتا۔ جس پر کوئی دھاگا نہیں باندھتا۔ مَیں تو ڈار سے بچھڑی کُونج ہوں جو تمہارے کارن پھر

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سے اپنی ڈار سے مل سکتی ہوں۔ کہتے ہیں کہ ''جس کو رب تارے اُسے کون مارے'' اور تم تو میرے لیے فرشتہ بن کر آئے ہو۔ اِس لیے میری مدد کرو۔ مَیں سجاول سے ملنا چاہتی ہوں۔ سانول اور نفیسہ کو ملنا چاہتی ہوں۔ بیٹا! حیاتی کچے گڑھے کی طرح بڑی بے اعتباری ہوتی ہے اِس لیے سانسوں کی ڈور ٹوٹنے سے پہلے مجھے راجوری لے چلو۔''

امّاں صابری کی آپ بیتی سُن کر مَیں بڑا غمگین ہو گیا۔ مَیں سوچنے لگا کہ اِس تقسیم سے ہر جگہ نفرت کی آندھی چلی۔ لاکھوں جانیں ضائع ہو گئیں۔ دھرم اور جنون کی راج نیتی نے آگ اور خون کی ہولی کھیلی۔ کروڑوں اِنسان اِس سونامی میں تباہ ہوئے پر کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ بربادی کے کھنڈروں نے صرف تاریخ رقم کی۔ زمین اپنی جگہ قائم رہی۔ وہ بانٹی نہیں جا سکی۔ تہذیب اور تمدّن بانٹا نہیں جا سکا لیکن زمین کو بانٹنے والے مر کھپ گئے، خاک میں مل گئے۔

مَیں نے امّاں صابری کو یقین دلایا کہ مَیں اُس کے پرمٹ کے لیے پوری کوشش کروں گا۔ پھر مَیں دس دِن تک لاہور، راولپنڈی، سیالکوٹ، گُجرات، قصور، ساہیوال، ٹیکسلا، ہڑپہ، اور شاردا کے تاریخی مقامات میں گھومتا رہا۔ ہندوستان کے قدیم سبھیا چار اور تہذیب کے عروج و زوال کو دیکھتا رہا۔ ویدوں کی دھرتی پر اُن کے تخلیق کرنے والوں کو ڈھونڈتا رہا۔ پر کھنڈروں کے علاوہ مجھے کچھ نہ ملا۔ پاگل اِنسانوں نے اپنی جڑیں خود کاٹ دی تھیں۔ ہمارے پرمٹ کی معیاد ختم ہو چکی تھی۔ اِس لیے ہم اپنا دَورہ مکمل کر کے مظفر آباد آ چکے تھے تا کہ دوسرے دِن سرینگر کے لیے واپسی کا سفر کر سکیں۔ رات مظفر آباد ڈویژن کے کمشنر کی جانب سے ہمیں عشائیہ دیا گیا۔ وہاں مَیں نے کمشنر صاحب کو امّاں صابری اور سجاول بابا کی دُکھ بھری کہانی سُنائی اور گذارش کی کہ امّاں صابری کو سرحد کے اِس طرف آنے کی اجازت دی جائے تا کہ امّاں صابری

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سجاول سے مل سکے۔ اپنے بچوں سانول اور نفیسہ کو گلے لگا سکے۔ کمشنر صاحب نے مجھے بھروسہ دِلایا کہ وہ امّاں صابری کے پرمٹ بنانے کے سلسلہ میں ہر طرح کی مدد کریں گے۔ صبح ناشتے کے بعد ہم مظفر آباد سے سرینگر کے لیے روانہ ہوئے۔ سرکاری افسروں اور ہزاروں لوگوں نے ہمیں رُخصت کیا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے پھر اُوڑی میں کھایا اور شام پانچ بجے ہم سرینگر پہنچ گئے۔ کشمیر کے انسپکٹر جنرل پولیس جاوید مخدومی نے ہمیں وہاں پولیس گیسٹ ہاؤس میں رکھا۔ دوسرے دِن ہم جموں اپنے گھر پہنچ گئے۔ یار احباب سب ہمیں ملنے آئے۔ وہ پاکستانی اِنتظام والے کشمیر (جسے وہاں آزاد کشمیر کہا جاتا ہے) سے متعلق پوچھنے لگے۔ وہاں کے حالات، لوگوں کی معاشی حالت، علاقے کی ترقی، تعلیم، سیاسی سوچ، غرض وہاں کے مجموعی حالات کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتے رہے۔ سارا دِن یہی باتیں ہوتی رہیں۔ شام کو مَیں نے سجاول بابا سے ٹیلیفون پر بات کی۔ سجاول بابا میری باتیں سُن کر اشکبار ہوگیا۔ مَیں نے اُسے حوصلہ دیا اور بتایا کہ جلدی ہی امّاں صابری اُنھیں ملنے راجوری آرہی ہے کیوں کہ اُس کے پرمٹ بننے کی کاروائی شروع ہوچکی ہے اور وہاں کے سرکاری افسروں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اِس سلسلہ میں وہ امّاں صابری کی پوری مدد کریں گے۔ سجاول بابا بہت خوش ہوا اور مجھے ڈھیر ساری دُعائیں دیں۔

تقریباً دو مہینے بعد سجاول بابا کا فون آیا۔ وہ بڑا خوش تھا۔ اُس نے بتایا کہ امّاں صابری ''چکّاں دے باغ'' والے راستے راولاکوٹ پونچھ والی بس سے آئی تھی اور وہ اُسے پونچھ سے راجوری لے آئے ہیں۔ اُس نے بتایا کہ امّاں صابری کو صرف پندرہ دِنوں کا پرمٹ ملا ہے جس کی معیاد مزید پندرہ دِن تک بڑھائی جاسکتی ہے جب کہ وہ چاہتا ہے کہ صابری کو یہاں رہنے کی مُستقل اجازت مل جائے کیوں کہ اِس کا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

وہاں کوئی نہیں ہے۔ اِس مقصد کے لیے وہ میری مدد چاہتا ہے۔ مَیں نے سجاول بابا کو سمجھایا کہ دونوں مُلکوں کے درمیان ایسا کوئی سمجھوتا نہیں ہے۔ پھر بھی کوشش کریں گا کہ ایسا ممکن ہو سکے۔ دِن گُزرتے گئے۔ مَیں سانول کو ساتھ لیے ہر متعلقہ افسر سے ملا۔ امورِ داخلہ اور خارجہ کے وُزرا اور وزیرِ اعلیٰ سے مُلاقاتیں کیں لیکن کچھ نہ بن سکا۔ ہماری ساری کوشش ناکام ہوگئی۔ ایک مہینہ گُزرتے پتہ ہی نہیں چلا۔ امّاں صابری کے جانے کا وقت قریب آ گیا۔ جانے سے دو روز قبل مَیں جموں سے راجوری گیا تا کہ امّاں صابری سے مِل سکوں۔ مَیں نے دیکھا کہ وہاں کُہرام مچا تھا۔ بچے اُداس بیٹھے تھے۔ سجاول بابا اور امّاں صابری رو رہے تھے۔ سانول اور نفیسہ بین کر رہے تھے۔ سجاول بابا کے ویران دِل کے اندر خوشیوں کا جو باغ کچھ وقت کے لیے کِھلا تھا، سجا تھا اور مہکا تھا وہ ویران ہو گیا تھا۔ اُس کا دِل مر چُکا تھا۔ اُس کی دُنیا دوبارہ اُجڑ چُکی تھی۔ اُس کے سینے کے زخم پھر سے ہرے ہو گئے تھے۔ وہ بے چین تھا۔ وہ رو رو کر کہہ رہا تھا:

''اِس عمر میں اِسے وہاں کون سنبھالے گا۔ وہاں اِس کا کون ہے۔ اگر صابری یہاں رہ جائے تو سرکار کا کیا جائے گا۔ 80 سالہ بُڑھیا سے سرکار کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔''

سجاول کی باتیں سُن کر ہر آنکھ بھر آئی تھی لیکن سب بے بس تھے۔ سجاول بابا نے اپنے طور پر بھی سبھی سرکاری دروازے کھٹکھٹائے تھے پر کسی نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ آخر وہ دِن آ گیا جب امّاں صابری کو ''چکّاں دے باغ'' سے راولاکوٹ جانا تھا۔ سجاول، سانول، نفیسہ اور اُن کے بچے امّاں صابری کو سرحد تک چھوڑنے آئے تھے۔ کسٹم پوسٹ پر ضروری جانچ پڑتال ہونے کے بعد امّاں صابری ہولے ہولے نو مین لینڈ کی جانب چل رہی تھی۔ سجاول بابا، سانول، نفیسہ اور امّاں صابری کے پوتے پوتیاں، نواسے اور نواسیاں اُسے جاتے دیکھ رہے تھے۔ امّاں صابری کی خواہش تھی کہ وہ زندگی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کی آخری گھڑیاں سجاول اور بچوں کے ساتھ گزارے لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ آدھے راستے میں پہنچ کر اماں صابری رُک گئی شاید ستانے کے لیے۔ وہ نو مین لینڈ کی دونوں جانب دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نظریں کبھی سجاول کو دیکھتیں تو کبھی اپنے بچوں کو۔ وہ دوبارہ چلنے لگی لیکن دو چار قدم چلتے ہی اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ گر پڑی۔ اُس کو اُٹھانے کے لیے دونوں ملکوں کے سرحدی محافظ دوڑے پر جب وہ اماں صابری کے پاس پہنچے تو اُنھوں نے دیکھا کہ اماں صابری کی روح جسم کا پنجر چھوڑ چکی تھی اور سارے قاعدے، قانون اور ضابطوں سے آزاد ہو چکی تھی۔

----☆----

نوٹ: اِس کہانی پر برِصغیر کی پہلی پوٹھوہاری (پہاڑی) فِلم بنائی گئی ہے۔ جس کا منظر نامہ اور مکالمے لندن میں مُقیم میر پور نواسی علی عدالت نے لِکھے اور ہدایت کاری جموں کے شیودت نے کی۔ یہ فلم کامیابی کے ساتھ دِکھائی گئی اور اِس نے بہت اچھا بزنس کیا۔ جموں اور ریاست کے دوسرے حِصوں میں یہ پچیس ہفتے سے زیادہ چلی۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

پریم کھیلن کا چاؤ

ہر بڑے آدمی کے عروج و زوال کی کہانی پُر اثر، فرحت بخش، کڑوی اور کسیلی ہوتی ہے۔ میری کہانی بھی بُلندی اور پستی کے حادثات سے بھری پڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں اپنی کہانی ہمایوں کے مقبرے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر لِکھ رہا ہوں کیوں کہ میری کہانی کے اہم کِردار کا نام بھی مرزا ہمایوں بیگ ہے اور اُس کا نصیب بھی ہمایوں کے ساتھ مِلتا جُلتا ہے۔ ہمایوں کے مقبرے کو دیکھ کر دِل خوشی اور غمی کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ مُغل کاریگری کا ایک شاندار نمونہ۔ اگر تاج محل کو غور سے دیکھو تو صاف لگتا ہے کہ اُس کا نقشہ ہمایوں کے مقبرے کے ساتھ بہت حد تک مِلتا ہے۔ اِس عظیم عمارت میں جہاں ایک جانب شہنشاہ ہمایوں اپنی قبر میں سویا پڑا ہے وہاں مقبرے کے چوگرد مُغل حکومت کے آخری شہزادے دفن ہیں، جن کو انگیزوں نے بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا تھا اور دہلی پر قبضہ کر لیا تھا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح آج کے زمانے میں عراق کے صدر صدام حسین، اُس کے بیٹوں اور بھائیوں کو امریکیوں نے مار ڈالا اور عراق پر قبضہ کر لیا۔ دُنیا کی سب سے خوبصورت عمارت تاج محل کی داستان بھی ہمایوں کے مقبرے سے مِلتی جُلتی ہے۔ اپنی پیاری اور دِلرُبا بیوی کی یادگار بنانے والا خُرم یا شاہجہاں بھی اپنے بیٹے کے ہاتھوں ذلیل ہو کر اور کئی سال قید میں گُزار کر اور اپنے سارے غم اپنے ساتھ لے کر سنگِ مرمر کے اِس مقبرے میں دفن ہو گیا تھا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

میرا کردار ہمایوں کی طرح کوئی شہنشاہ نہیں ہے جس نے اپنے بھائیوں کو پیار اور شفقت سے پالا اور اُن کو الگ الگ صوبوں کا حاکم بنا دیا لیکن اُن بدبختوں نے غدّاری کی اور دُشمنوں سے مِل کر ہمایوں کی حکومت کا خاتمہ کرا دیا۔ ہمایوں شیر شاہ سُوری کے ہاتھوں شکست کھا کر کئی سال در بدر پھرتا رہا۔ شاید اُس کے ازبک خون اور تاتاری دُودھ میں کوئی کھوٹ تھی کہ اُس کے پڑپوتے کے ساتھ بھی ویسا ہی ہوا۔ وہ بھی بیٹوں کے ہاتھوں خوار ہوا، جس طرح میرے کردار کو ہونا پڑا۔ میرے کردار ہمایوں نے بھی اپنے بھائیوں، دوستوں اور قرابت داروں کے ہاتھوں گہرے زخم کھائے مگر اُس نے حوصلہ نہیں ہارا بلکہ محنت اور مشقت کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ دِن رات کام کیا، دولت کمائی، جائداد بنائی اور سماج میں اپنی دستار کو ستکار دلایا۔ اُس نے اپنی اولاد کو نازوں سے پالا۔ اُنھیں وہ سب کچھ دیا جس کا وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اُن کی شادیاں دُھوم دھام سے کرائیں اور عالیشان کوٹھیاں بنا کر دیں، تاکہ وہ اپنی زندگی خود جی سکیں۔

لیکن وہ ابھی بھی ہمایوں کے کندھوں پر چڑھ کر دھاڑتے رہتے ہیں۔ کیڑے مکوڑے، پرند چرند اور جانور ہوش سنبھالتے ہی اپنے جنم دینے والوں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ ماں باپ کے بنائے گھونسلوں سے اُڑ جاتے ہیں اور اپنے گھونسلے اور ٹھکانے الگ بنا لیتے ہیں۔ وہ پھر اُن کے ساتھ چمٹے نہیں رہتے۔ مگر مرزا ہمایوں بیگ کے جیو جنتر اُڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ہمایوں نے اُنھیں اپنے شانوں سے اُتارنے کے بہت جتن کیے پر وہ اُس کو چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ وہ ہمایوں کے کندھوں پر سوار رہتے ہیں۔ اُس کے جسم کے گوشت کو نوچتے رہتے ہیں۔ اُس کا جسم درد سے کراہتا رہتا ہے مگر اُن پر اِس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ایک زمانہ تھا کہ لوگ ہمایوں کے چمتکار کو نمسکار کرتے، پر اب اُس کا کاروبار بھی ختم ہو چُکا ہے اور سرکار دربار کا ستکار بھی۔ عیش و عشرت کا زمانہ لد چُکا تھا، لیکن اُس کے دونوں بیٹوں کو وہم نہیں بلکہ یقین تھا کہ ہمایوں کے پاس قارون کا خزانہ دبا پڑا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ پر وہ نہیں جانتے تھے کہ دولت تو مُنڈیر پر بیٹھنے والی چڑیا ہے جو کبھی ایک ڈال پر نہیں بیٹھتی۔ یہ کسی سے وفا نہیں کرتی لیکن وہ پھر بھی اپنی ضرورتوں کے لیے اُس کی پگڑی اُچھالتے رہتے اور خود فاختہ اُڑاتے رہتے۔ اب ہمایوں کے پاس نہ دولت تھی نہ عزت۔ وہ کنگال اب سوکھے پتوں کی داستان بن چُکا تھا۔ اُس کی گرہستی کب کی جل چُکی تھی لیکن وہ کمبخت جلے ہوئے گھر کی راکھ کو بھی زرِ خالص سمجھتے اور اُسے کُریدتے رہتے۔ وہ اناج کے کیڑے تھے اور نشے کے روگی۔ اُنھوں نے پہلے شراب کے سنگ یاری لگائی۔ پھر افیم کی دِلداری اور آخر چرس اور گانجے کی سرشاری بھی ساتھ ملا لی تھی۔ اِس کام میں وہ اِتنے مشغول رہتے کہ صبح سے ہی افیم کے ڈوڈوں کو پاچھتے رہتے۔ اُنھوں نے بے حیائی کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ اُن کو محنت اور ایمانداری کی روٹی ہضم نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہٹ دھرمی، غرور اور گھمنڈ کا شکار تھے۔ اُن کے سلوک میں سلیقے اور حلیمی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ بدکلامی کرتے۔ رشتے داروں اور ہمسائیوں کے ساتھ ایسی زبان میں بات کرتے کہ لفظوں کی پنکھڑیاں بھی زخمی ہو جاتیں۔ وہ بات بات پر دُشنام طرازی پر اُتر آتے اور قانون کی گردن دبوچ لیتے۔ وہ دونوں عقل کے بھوکے تھے کیوں کہ عقل ذات رب کی یہ وارث نہیں سب کی۔ ہمایوں اپنے بیٹوں سے بیزار تھا کیوں کہ وہ ہمایوں کو ایک کُوڑا دان سمجھتے جس میں وہ اپنی ناجائز ضرورتوں کا کُوڑا کرکٹ پھینکتے رہتے۔

جن لوگوں کو اپنا جیون سنوارنے اور خوشحال زندگی گُزارنے کی تمنّا ہوتی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہے وہ کامیابی کی منزلیں سر کر لیتے ہیں لیکن نکمے اور بے شرموں کو تو آستانوں سے بھی دھکّے ملتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ پکی ہانڈی کا ہر کوئی یار ہوتا ہے لیکن بجھے چولہوں کا کوئی شریک نہیں ہوتا۔ ہمایوں کے بیٹوں کے لیے باپ کا مال گُڑ سے بھی میٹھا تھا۔ وہ خالی برتن تھے جو گھر میں ہی کھڑکتے رہتے۔ وہ سیوا کر کے میوہ کھانے میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے گھر کا یہ حال تھا کہ انڈے بُول میں اور بچے کھجور میں۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر ہمایوں لاچار ہو چُکا تھا۔ وہ دُکھوں کا مارا اپنی آنکھوں کے آنسو صاف کرتا رہتا۔ اُس کی نظریں روز ہجرت کرتی رہتیں لیکن مایوس و بے بس ہو کر دوبارہ اپنے دیدوں میں آجاتیں۔ اُس کے نصیب کی ناؤ دُکھوں کے طوفان میں ڈولتی رہتی۔ اُس کا سوگ اُس کے دِل کا روگ بن گیا تھا۔ اُس کے نکھٹو بیٹے اُس کی خوش بختی لُوٹ کر لے گئے تھے۔ اُداسی اور خاموشی کے ناگ اُس کے اندر کُنڈلی مار کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ رُوپ، جوانی، راج اور دولت سب ٹھگ ہیں۔ یہ تیتر کسی کے مِیت نہیں ہوتے لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ وہ رِشتوں کے کیچڑ میں دھنسا پڑا تھا اور سمجھتا تھا کہ اُس کے کرموں کا کوئی شریک نہیں۔ بے بسی کی جھُریاں ہمایوں کے چہرے پر صاف دِکھائی دیتی تھیں۔ اُس کی زندگی کی دیوار کا پلستر جگہ جگہ سے اُتر رہا تھا اور دیوار ننگی ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک آدھ برسات میں یہ دیوار ڈھے جائے گی۔

ہمایوں اپنی زندگی میں کسی عقیدے یا فلسفے کی کال کوٹھڑی میں بند نہیں ہوا بلکہ اُس نے دِل اور دماغ کے دروازے کُھلے رکھے اور اپنی رُوح کو پاک اور صاف رکھا پر اب وہ چاہتا تھا کہ اُس کی رُوح جسم چھوڑ کر کہیں فرار ہو جائے اور ذِلّت اور رسوائی سے بچ جائے کیوں کہ شرافت اُس کے گھر کی باندی تھی اور ضمیر کی کلغی اُس کی پگڑی کا تاج

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

لیکن آج دستار گر چکی تھی۔ اور عزّت لُٹ چکی تھی اور عزّت لوٹنے والے کوئی اور نہیں، اُس کے اپنے بیٹے تھے۔

ہمایوں کے بیٹے اپنے عیبوں اور کمزوریوں کی وجہ سے ہمیشہ اپنی بیویوں کے دانتوں میں دبے رہتے۔ وہ اپنی عورتوں کے پیروں کے گھنگرو تھے جو تال بے تال بجتے رہتے۔ وہ رنّ مُرید خُشک دریا تھے، جن میں عقل کی طُغیانی کبھی نہیں آئی۔ اُن کی مُرغیاں انڈے تو پرائے گھروں میں دیتیں لیکن کُڑکُڑا اپنے گھر میں کرتیں۔ سارے ہمایوں کے ساتھ جادُوگریاں اور چھل فریب کرتے رہتے۔ بھلا بے حیا لوگوں کے ناک کاٹنے والے بھی تو آخر تھک جاتے ہیں اور اُنھیں اپنے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔

ہمایوں نے بھی اُن نالائقوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ اب ایک ٹُوٹا پھُوٹا پنجر تھا۔ اُس کا سب کُچھ ختم ہو چُکا تھا۔ اُس کے دِل کا کوئی محرم نہیں تھا۔ وہ غم زدہ سُکھ تلاش کرتا پھرتا مگر سُکھ نے تو آنکھیں پھیر لی تھیں۔ اُس کے بیٹے اُس کی عُمر کے ٹُنڈ مُنڈ درخت پر پھر ہریالی لانے کے قابل نہیں تھے اور نہ ہی وہ اُس کا سایہ بننے کے لائق۔ ہمایوں کی زندگی کے کمال اور جمال کو زوال آ چُکا تھا۔

وہ لمبے عرصہ تک سوچتا رہا۔ اپنے ماضی میں جھانکتا رہا۔ پھر اُس نے اپنے من کے کواڑ کھول کر دیکھا تو اُسے پتہ چلا کہ دُنیا ایک سراب ہے اور جیون اِس صحرا میں پانی کا ایک بُلبُلہ۔ پھر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ جھوٹے رشتوں کے جال سے جتنی جلدی باہر نِکلا جائے اُتنا ہی اچھا ہے۔ اُس کے پاس جتنے بھی سانس باقی بچے تھے وہ اُس کی زندگی کا کُل سرمایہ تھے اور وہ اپنی بچی ہوئی سانسوں کو اب ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے دِل کے طاقچے سے یادوں کی کتابیں، موہ کی پوٹلیاں اور خواہشوں کی گانٹھیں اُٹھا کر باہر پھینک دیں اور فقیری چولا پہن لیا اور مُرشد کے اِس کٹھن کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ارتھ تلاش کرنے لگا:

جو تم پریم کھیلن کا چاؤ
سِر دھر تلی گلی میری آؤ

اُس نے اپنے ساتھ بیتے حادثات کے اتہاس کو سینے کی قبر میں دفن کر دیا۔ اپنے کرموں کی رُوئی کو دُھنا۔ عملوں کے چرخے پر سُوت کاتا۔ انحد کی کھیسی بُنی۔ رُوح کو کھیسی میں لپیٹا اور یوں زندگی کے دریا کو شانت ساگر کے اندر جذب کر دیا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ایک مرے بندے کی کہانی

اُس دِن بھاری برف پڑ رہی تھی۔ شام تک دو اڑھائی فُٹ برف جمع ہو چکی تھی۔ سارا گاؤں برف کی چادر تلے دب چُکا تھا۔ ایسی حالت میں میرا گھر جانا بہت ہی مُشکل تھا کیونکہ میری پن چکّی (گھراٹ) سے میرے گھر کا فاصلہ تین کلومیٹر تھا اور برف پر چلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اِس لیے مَیں نے پن چکّی میں ہی رات گُزارنے کا فیصلہ کیا۔ مَیں نے آلو اور موٹھ پکائے اور مکئی کے آٹے کی روٹیاں بنائیں اور تمر و کی چٹنی کے ساتھ کھانا کھا کے سو گیا۔ رات کے کوئی دس گیارہ بجے ہوں گے کہ کسی نے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔ میری نیند کُھل گئی اور مَیں دروازہ کھولنے کے لیے اُٹھا۔ مَیں نے پوچھا، ''بھائی کون ہے؟''

''دروازہ کھولو، ہم مسافر ہیں۔ برف گر رہی ہے۔ سفر کرنا بہت مشکل ہے۔ برف بند ہونے تک ہم تمہارے پاس رُکیں گے۔'' مَیں نے دروازہ کھولا۔ چار خوبصورت نوجوان کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ اُن کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں اور اُنھوں نے پِٹھو اُٹھائے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اپنی پیٹھ سے سامان اُتارا اور دیوار کے ساتھ رکھ دیا۔ پھر اُن میں سے ایک کہنے لگا:

''اُٹھو منظور! ہمارے لیے کھانا بناؤ۔ ہم صبح سے بھوکے ہیں۔ بہت لمبا سفر کر کے آئے ہیں۔ کل رات ہم مرمت کے علاقے میں تھے۔ آج کی رات یہاں رُکیں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گے اور صبح تڑکے تہجد کے وقت یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''لیکن تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟ تم تو مجھے یہاں کے رہنے والے نہیں لگتے۔ پھر تم مجھے کیسے جانتے ہو؟''

ہم تمہیں ہی نہیں بلکہ تمہارے پورے خاندان کو جانتے ہیں۔ تمہارے باپ کا نام محمد امین ہے جو ڈوڈو پنچایت کا سرپنچ ہے۔ تمہارا گھر موضع سگاڑی میں ہے۔ تمہارے تین بھائی ہیں۔ تمہاری ایک بہن جکھیڑ میں بیاہی ہوئی ہے اور دوسری دھونا میں۔ تمہاری عمر 35 سال ہے۔ تُم شادی شُدہ ہو اور تمہارے تین بچے ہیں۔ تم روز اذان کے وقت پن چکّی پر آتے ہو اور چراغ جلنے کے وقت گھر جاتے ہو اور بتاؤ کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''پر تم لوگ کون ہو؟ مَیں تمہیں نہیں جانتا۔''

''تم ابھی بھی نہیں سمجھے۔ ہمیں ساری دُنیا جانتی ہے۔ اِن بندوقوں کو دیکھ رہے ہو۔ اِن تھیلوں میں پڑے بارُود کو دیکھ رہے ہو۔ ہم مجاہد ہیں۔ بھارتی سامراج کے خلاف لڑنے والے مجاہد۔ ہم تمہاری آزادی کے لیے بھارتی فوجوں اور پولیس کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ تم جلدی روٹی پکاؤ اور ہمیں کھلاؤ۔''

مَیں نے مکئی کا آٹا گوندھا اور روٹیاں پکائیں۔ موٹھ اور آلو کا سالن بچا ہوا تھا۔ اخروٹ کی گریوں، پُودینے اور تمر و کی چٹنی بنائی اور کھانا اُن کے سامنے رکھ دیا۔ وہ سبھی بھوکے تھے اِس لیے چند منٹوں میں ہی کھانا کھا کے فارغ ہو گئے اور میرے ساتھ باتیں کرنے لگے۔

ہم ''حزب المجاہدین'' جماعت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہم ڈوڈہ، کشتواڑ، گُول، مہور اور رام نگر کے علاقوں میں اپنی کاروائیاں کرتے ہیں۔ ہمارا امیر شکیل

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

انصاری ہے۔ ہمارے مجاہد پولیس اور فوجیوں سے ٹکّر لیتے رہتے ہیں۔ تم ریڈیو، اخباروں اور ٹیلی ویژن پر ہمارے کارنامے پڑھتے اور سُنتے ہوگے۔ کل ہم نے بسنت گڑھ تھانے پر حملہ کرنا ہے۔ وہاں کے تھانیدار رشید خان نے ہمارے سابقہ امیر کو ایک مُخبر کی اِطلاع پر ایک مکان میں سوتے ہوئے دبوچ لیا تھا اور ایک فرضی مقابلے میں بڑی بے رحمی سے شہید کر دیا تھا اور سرکار کی طرف سے انعام اور ترقی حاصل کی تھی۔ کل ہم نے اُس کے ساتھ حساب برابر کرنے جانا ہے اور تم ہمارے ساتھ چلو گے کیوں کہ ہمیں راستے کا پتہ نہیں ہے۔

"مَیں نے بڑی منت سماجت کی کہ وہ مجھے چھوڑ دیں اور ساتھ نہ لے جائیں کیوں کہ اگر پولیس اور فوج کو پتہ چل گیا تو وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ میرے والدین، بہن بھائی، عذاب میں پھنس جائیں گے پَر اُن خبیثوں نے میری ایک نہ سُنی۔ میرے سر آئی بلا نہیں ٹل سکی۔ بھلا زور کے آگے زاری کیسی۔ پھر حادثے تو تقدیر کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اُنھوں نے تہجد کی نماز پڑھی اور چل پڑے۔ کرچی کا نالہ پار کر کے ہم بسنت گڑھ والی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ امیر کا سامان مَیں نے اُٹھایا ہوا تھا۔ تین گھنٹوں کی مسافت کے بعد ہم پہاڑ کی اُس چوٹی پر پہنچ گئے جہاں سے بسنت گڑھ کا قصبہ صاف دِکھائی دے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ مَیں امیر کے پاؤں دبانے لگا اور گڑگڑانے لگا کہ وہ مجھے یہاں سے واپس بھیج دیں کیوں کہ دِن چڑھے لوگ گندم اور مکئی پسوانے کے لیے آنے لگتے ہیں۔ امیر نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ ساتھ میں دھمکی بھی دی کہ اگر مَیں نے اُن کے بارے میں زبان کھولی اور کسی کو بتایا تو وہ مجھے جان سے مار دیں گے اور میرے گھر کو آگ لگا دیں گے۔ بھلا سانپوں کے بِل میں ہاتھ کون ڈالے۔ مَیں واپس اپنے ٹھکانے پر آ گیا اور چُپ چاپ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اپنا کام کرنے لگا۔ اِس واقعہ کے بارے میں مَیں نے کسی سے بات نہیں کی۔ ماں باپ سے، نہ بہن بھائیوں سے اور نہ بیوی سے۔ میرا دہشت گردی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ مَیں پن چکّی چلانے کے علاوہ پنچایت کے چھوٹے موٹے کام کر کے اپنی گرہستی چلا رہا تھا۔''

مندرجہ بالا بیان مَیں نے اُدھم پور کے ایس ایس پی کے سامنے دیا تھا جو ایک نوجوان افسر تھا۔ اُس نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا اور مجھے ملی ٹینٹ کے رُوبرُو کیا جس نے تفتیش اور انٹیروگیشن میں میرا نام لیا تھا۔ ملی ٹینٹ نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اُس کے بیان کے ساتھ میرا بیان ملایا گیا۔ ہم دونوں کے بیان ایک دوسرے کے ساتھ ملتے تھے۔ اُدھم پور کے ایس ایس پی صاحب میری باتوں سے مطمین تھے۔ اُن کو یقین تھا کہ میرا ملی ٹینٹوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور مَیں نے صرف ڈر کے مارے کھانا کھلایا تھا۔ اُنھوں نے مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی اور آئندہ سے مجھے محتاط رہنے کی ہدایت کی اور کہا کہ مَیں اپنے کام سے کام رکھوں۔

پر اُس دِن کے بعد تھانیدار مجھے وقت بے وقت تھانے میں بُلاتا رہتا۔ دھمکیاں دیتا، مار پیٹ کرتا اور بدسلوکی کرتا رہتا۔ ایک دِن میرے ابُو مجھے ساتھ لے کر دوبارہ ایس ایس پی صاحب سے ملے اور تھانیدار کے رویّے کے بارے میں شکایت کی۔ اُس نے ضروری کاروائی کرنے کا یقین دِلایا مگر چند دِنوں بعد اُس نیک افسر کا تبادلہ کسی اور جگہ پر ہو گیا اور اُس کے مُتبادل میں ایک دوسرے بددماغ ایس پی کو تعینات کیا گیا جس نے ہماری شکایت پر کوئی کاروائی نہیں کی اور ہماری عرضی ردّی کی ٹوکری میں پھینک دی۔ تھانیدار نے ہمیں زیادہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ بس اُس بھلے مانس افسر کے جانے کے بعد ہم پر مصیبتوں اور پریشانیوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اُس

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

تھانیدار کی بدسلوکیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اُسے پاکھنڈ، گھمنڈ اور موہ مایا کی بیماری تھی اور کرودھ کا کینسر بھی۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے پولیس مجھے پکڑ کر لے جاتی اور دوبارہ وہی سوال دُہرائے جاتے جن کا جواب میں کئی بار دے چُکا تھا۔ بزرگوں کا یہ کہنا غلط ثابت ہو گیا تھا کہ ''اندر ہو سچ تو باہر جا کے نچ۔'' پولیس سچ کو جھوٹ بنانے پر بضد تھی۔ تھانیدار سے لے کر ایس پی صاحب تک سارے پولیس افسر میری تفتیش کرتے، مجھے اذیتیں دیتے۔ وہ چاہتے تھے کہ مَیں اُن کے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھوں۔ وہ سارے شکاری تھے اور مَیں اُن کا شکار لیکن اُن کو کون سمجھاتا کہ ہر گھونسلے میں بوٹ نہیں ہوتے۔ اُن کی بے رحم آنکھیں مجھ پر قہر ڈھاتیں۔ وہ مجھے مارتے۔ ٹکٹکی لگاتے۔ مجھے میری زندگی کی کوکھ میں موت پلتی دِکھائی دیتی تھی۔ میرا گھر، میرے ماں باپ، بہن بھائی اور بیوی بچے سب بے بسی کی بھٹی میں جل کر راکھ ہو رہے تھے مگر پولیس والے میری سچائی کا جل پینا ہی نہیں چاہتے تھے۔ میرے ابُو مجھے بچانے کے لیے بڑی تگ و دو کرتے۔ بڑے بڑے افسروں اور سیاستدانوں کے آگے ماتھا رگڑتے اور گڑگڑاتے۔ اُن کی آنکھوں کا دریا کناروں سے باہر بہنے لگتا مگر کسی کو اُن پر رحم نہیں آتا۔ مایا کی چھایا کے بغیر میری خلاصی نہیں ہوتی تھی۔ ایک موٹی رقم دینے کے بعد میرا چھُٹکارا ہوتا۔ ہر نیا تھانیدار چارج سنبھالتے ہی مجھے حوالات میں بند کر دیتا اور میرے ابُو رشوت دے کر مجھے چھُڑا لاتے۔ اِس سرکاری دہشت گردی میں ہماری زمین جائداد بِک گئی۔ مال مویشی بِک گئے، پر ہماری فریاد کی دادرسی کسی نے نہیں کی۔ اِنصاف کے برتن ہمیں ہر جگہ خالی ملے۔ ہمیں کوئی بھی اپنے ضمیر کے ساتھ وفا کرتا نہیں ملا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ من ٹُوٹتے اور دُودھ پھٹتے دیر نہیں لگتی۔ میرے والدین کی عزّت اور غیرت کا چولا تار تار ہو چُکا تھا۔ یہ سب دیکھ کر میرے اندر کا جوالا مُکھی پھٹنے لگا۔ ذِلّت اور رسوائی نے ہمارے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

لیے سارے راستے بند کر دیئے تھے اِس لیے ایک دِن مَیں نے ابُو سے کہا:

''میری وجہ سے تمہاری زمین، جائداد، دولت اور عزّت سب ختم ہو چکی ہے۔ تم نے مجھے بچانے کے لیے خود کو بھی داؤ پر لگا دے لیکن سب بے کار ہو گیا۔ اب تمہارے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچا ہے۔ اِس لیے اب مجھے گھر سے جانے کی اجازت دے دو۔ مَیں اب اُن ملی ٹینٹوں کے پاس ہی جاؤں گا جن کی وجہ سے ہماری یہ حالت ہوئی ہے۔ اِس لیے کہ میرے پاس اب کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ یہاں ہمارے ماتھے پر لکھی بدنامی کوئی نہیں مٹا سکتا۔ اِس لیے میری غلطیاں، گستاخیاں اور بیوقوفیاں معاف کر دینا۔''

میری باتیں سُن کر ابُو رونے لگا۔ امّاں، بھائی، بہنیں اور بیوی سب چیخنے چلّانے لگے۔ دُکھ درد اور پریشانیوں کے لیے لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو چہروں پر لکھی ہوتی ہیں اور یہ لِکھائی مَیں نے سب کے چہروں پر پڑھی تھی لیکن میرا ارادہ پکا تھا۔ رات کو جب سبھی سو گئے تو مَیں گھر سے نِکلا اور سیوج دھار کی طرف چل پڑا اور سنگلاخ پہاڑی پگڈنڈی چڑھنے لگا۔ دوسری صُبح مَیں سیوج کے میدان میں تھا۔ سیوج کے ایک طرف بھدرواہ اور چمبہ کے قصبے ہیں اور دوسری طرف ڈُوڈُو اور بنّی کے علاقے۔ توی، اُجھ اور نیر وندیاں سیوج کے پاس باس کُنڈ سے نکلتی ہیں۔ یہاں ہر سال کیلاش یاترا آتی ہے۔ ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔ ہزاروں شردھالو پوجا پاٹھ کرتے ہیں۔ سیوج جڑی بوٹیوں کے لیے بھی مشہور ہے۔ گرمیوں میں گوجر، بکروال اور گدّی اپنے گھوڑے، گائے بھینس اور بھیڑ بکریاں لے کر یہاں چراگاہوں میں آتے ہیں۔ اِن لوگوں نے یہاں عارضی ٹھکانے بنائے ہوتے ہیں جن میں یہ لوگ رہتے ہیں۔ مَیں نے بھی ایک دِن اور ایک رات ایک گدّی کے ساتھ اُس کے کچّے کوٹھے میں گُزاری۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دوسرے دِن ایک نوجوان نے مجھے پہچان لیا۔ وہ گدّی کے پاس بکرا خریدنے کے لیے آیا تھا۔ بکرا خرید کر جب وہ جانے لگا تو اُس نے مجھے اشارے سے بُلایا اور پوچھا کہ کیا مَیں کرچی میں لگی پن چکّی کا مالک منظور ہوں؟ جب مَیں نے ہاں میں سر ہلایا تو اُس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ مَیں چُپ چاپ اُس کے ساتھ چلتا رہا۔ کوئی دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم ایک گُپھا میں داخل ہوئے۔ مَیں اپنی منزل پر پہنچ چُکا تھا۔ امیر نے مجھ سے میرے ساتھ بیتی ساری کہانی سُنی۔ پھر اُس نے مجھے ایک نوجوان ابُو حمزہ کے حوالے کر دیا جس نے مجھے ہتھیار چلانے کی تربیت دی۔ ایک مہینے کے بعد امیر نے مجھے کچھ بندوق برداروں کے ساتھ کاروائی کرنے کے لیے بھیجا۔ مَیں اپنی مرضی سے ملی ٹینٹ نہیں بنا تھا۔ مَیں تو سرکاری آتنک واد کا شکار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مَیں اُن کے ساتھ رہ کر بھی اُداس رہتا۔ گُم سُم، خاموش۔ مجھے اُن کے رنگ ڈھنگ اچھے نہیں لگتے تھے۔ نفرت اور جنون نے اُن کی عقل گروی رکھ لی تھی۔ وہ مذہب کو سیاست کے لیے استعمال کرتے تھے اور یوں مذہب کی توہین کرتے تھے۔ گھٹیا رہن سہن، لاعلمی اور کم عقلی نفسیاتی بیماریاں ہوتی ہیں اور یہ بیماریاں اِن بھٹکے ہوئے نوجوانوں میں بھی تھیں۔ آتنک واد بڑا ظالم ہوتا ہے۔ چاہے یہ سرکاری ہو، چاہے دہشت گردوں کی طرف سے ہو۔ یہ امن کو یرغمال بناتا ہے اور اِنصاف کو یتیم۔ مَیں بھی یتیم بن گیا تھا اور میرے بیوی بچے بھی۔ میرے گھر کو جانے والے سارے راستے بند ہو چُکے تھے۔ اُن پر پسیاں پڑی تھیں۔ میرے جانے کے بعد میرے گھر کا کوئی بھی فرد سُکھ شانتی سے جی نہیں سکا۔ دُکھوں اور مُصیبتوں کے آسیب نے سب کو نگل لیا تھا۔

دِن گُزرتے گئے۔ فوج اور پولیس پارٹیاں ہمیں پکڑنے کے لیے جگہ جگہ چھاپے مارتی رہتیں۔ ہم اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے۔ ہم اکثر غیر مُسلموں کے گھروں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

میں راتیں گزارتے۔ وہ بے چارے ڈر کے مارے ہمیں کھانا کھلاتے اور سونے کے لیے بستر دیتے۔ ایک دِن امیر نے مجھے ڈوڈو کے نمبردار ٹھاکر منگل سنگھ اور اُس کے بیٹے کو قتل کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ وہ پولیس کا مُخبر ہے اور اُس کی مُخبری کی وجہ سے اُس کا بھائی فاروق انصاری اپنے تین ساتھیوں سمیت مارا گیا تھا۔ مَیں ٹھاکر منگل سنگھ کو اچھی طرح سے جانتا تھا۔ وہ ہمارے گاؤں کا سب سے عمدہ شخص تھا۔ ہندو مُسلم بھائی چارے کا علمبردار، غریب پرور، مظلوموں کے حق کے لیے لڑنے والا فرشتہ اِنسان اور میرے ابُو کا بچپن کا دوست۔ لہٰذا مَیں یہ ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا کہ چاچا منگل سنگھ مُخبری کر سکتا ہے۔ وہ ایک سچا اِنسان تھا اور گاؤں کی شان۔ مَیں نے اِس مشن پر جانے سے صاف اِن کار کر دیا۔ میری حُکم عدولی اور نافرمانی پر امیر طیش میں آ گیا اور اُس نے مجھ سے بندوق چھین لی اور اِس کام کو سرانجام دینے کے لیے دو ملی ٹینٹوں کو بھیج دیا۔ موقع ملتے ہی مَیں نے ہاشم گوجر کو ڈوڈو روانہ کیا، جس کا ڈیرا اُن دِنوں سیوج میں تھا تا کہ منگل چاچا کو ہوشیار کیا جا سکے۔ ٹھاکر منگل سنگھ ایک وفد لے کر ڈپٹی کمشنر اُدھم پور سے ملا جس نے گاؤں میں پولیس چوکی بٹھا دی تا کہ لوگوں کی حفاظت کی جا سکے۔ ایسا ہی ایک واقع اور ہوا۔ امیر نے مجھے لاٹی کے مہاجن کستوری شاہ اور کرشن لعل کا کام تمام کرنے کا حُکم دیا۔ مَیں نے لاٹی جانے سے اِن کار کر دیا کیوں کہ وہاں میرا چھوٹا بھائی اور اُس کا عیال رہتا تھا۔ اور بھی کئی رشتے دار وہاں رہتے تھے جن کے کستوری شاہ اور کرشن لعل کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ اب کی بار امیر خاموش رہا اور مجھے کچھ نہیں کہا۔ ایک دِن امیر نے اپنی سربراہی میں ایک فوجی چوکی پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا، لیکن مجھے کوئی ہتھیار نہیں دیا۔ مَیں نہتا اُن کے ساتھ چل رہا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ پیچھے سے کسی نے دو گولیاں چلائیں جو سیدھی میری پیٹھ پر جا لگیں۔ مَیں گر

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

پڑا اور تڑپنے لگا۔ مَیں نے دیکھا کہ میری حالت دیکھ کر امیر اور دوسرے ساتھی ہنس رہے تھے۔ گو کہ اُن کے منہ پر کلمہ اور ہاتھ میں اسلحہ ہوتا لیکن اُن کے دِل بے رحم تھے۔ وہ آگ لگانا تو جانتے تھے لیکن آگ بُجھانا نہیں۔ اُن کے عقیدے کو عِلم اور گیان کی ضرورت تھی تا کہ وہ دہشت کو محبت کے حوالے کر سکیں۔ پر وہ کم ظرف تھے اور کم ظرفوں کی یاری ذلّت اور خواری دیتی ہے جس کا ثبوت مجھے مل چُکا تھا۔ مَیں کچّی مٹی کا ٹھیکرا تھا، سوٹوٹ گیا اور ختم ہو گیا۔ آسمان نے میری روح کے لیے اپنے دروازے کھول دیے اور میری مٹی کو برف کے نیچے دبا دیا گیا۔ کسی کو میری موت کا پتہ نہیں چلا۔ میرے گھر والے سمجھتے رہے کہ مَیں مِلی ٹینٹوں کے ساتھ ہوں اور پولیس مجھے پکڑنے کے لیے چھاپے مارتی پھرتی۔

پھر ایک دِن میرا قاتل غُلام حیدر، جس کا کوڈ نام ابُو زرقہ تھا، دہلی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ تفتیش کے دوران اُس نے سبھی گُناہ قبول کر لیے جِس میں میرا قتل بھی شامل تھا۔ دہلی پولیس نے ابُو زرقہ کو اُدھم پور پولیس کے سُپرد کر دیا۔ اُس کی نشان دہی پر میری لاش سیوج کی دیشتر پہاڑی ڈھلوانوں کے پاس برف کے نیچے سے نکالی گئی۔ میرے ابُو نے میری لاش کو پہچان لیا اور یوں مجھے موضع سگاڑی میں اپنے خاندانی قبرستان میں دفنایا گیا۔ میرے جنازے کو کندھا دینے کے لیے منگل چاچا بھی آیا تھا۔ کستوری شاہ اور کرشن لعل بھی۔ آج مَیں اِس قبر میں پُرسکون سویا ہوا ہوں کیوں کہ مَیں ایک ایسا ملی ٹینٹ تھا جِس نے اِنسانیت کا قتل کبھی ہونے نہیں دیا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

آدمی کے اندر چُھپا آدمی

''جناب! دیش کیا آزاد ہوا، ہمارے لیے عذاب ہوگیا۔ ہم تیسرے درجے کے شہری بن گئے۔ ہماری حالت شُودروں سے بھی بدتر ہوگئی۔ ہماری پہچان مُلک دُشمن، غدّار، جُونی اور دہشت گرد بنا دی گئی ہے۔ ہمیں ہر میدان میں پچھاڑ دیا گیا ہے۔ ہم غُربت اور مسکینی کی بھٹی میں جل رہے ہیں۔ ہم لاچار ہوچکے ہیں۔ ہماری لاچاری پربت سے بھی بھاری ہے۔ ہمارے اندر دراڑیں ہی دراڑیں ہیں۔ ہمارے گھروں میں پھیلی اُداسی انھیں خوشحالی دِکھتی ہے۔ یہ ترشول، نیزے، بھالے، تلواروں اور بندوقوں سے ہماری شناخت ختم کرنا چاہتے ہیں۔ شیخ سعدی نے ٹھیک ہی فرمایا ہے کہ جس کے ہاتھ میں تیغ، اُسی کے ہاتھ دیگ اور یہ لوگ ہماری ہی دیگ میں ہمارے ہی لہو سے ہمارا ہی گوشت اُبالتے ہیں اور کُتّوں کو کھِلاتے ہیں۔ ہماری تو دیش ماتا سوتیلی ہے اور باپ قصائی۔ یہاں برابری، غیر جانبداری اور آزادی کے نعرے کھوکھلے ہیں کیوں کہ سوراج اِن کا، راج اِن کا، تخت اور تاج اِن کا۔ ہمارا کیا ہے؟ ہمارے نہ گھٹنے ہیں نہ ٹخنے۔ جبھی تو سبھی ہمیں بندھوا سمجھتے ہیں۔ ہم نہ سوئی کے قابل ہیں نہ سلائی کے۔''

''ضمیر احمد! اتنے جذباتی نہیں ہوا کرتے۔ سبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ آدمی آدمی میں انتر ہوتا ہے کوئی ہیرا تو کوئی کنکر ہوتا ہے۔ بدخصلت اِنسان ہر قوم، ہر فرقے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اور ہر برادری میں ہوتے ہیں۔ تنگ نظری، انتہا پسندی اور جنونیت دونوں اطراف ہے۔ ہمارے خبطی مولوی بھی تو اپنے سوائے سب کو کافر سمجھتے ہیں اور لوگوں کو جہالت کی چھڑیاں مارتے رہتے ہیں۔ بھگت کبیر کہتے ہیں:

؎ اول اللہ نور اُپایا، قُدرت کے سب بندے
ایک نور تے سب جگ اُپجیا، کون بھلے کو مندے

پر یہ مولوی اپنی پھُونکنی سے موت کے فتوے پھوُنکتے رہتے ہیں۔ بیٹا! ہر کوئی سانس کا بھوکا ہوتا ہے، پر یہ غریب اور معصوم نوجوانوں کو مذہبی جنُون کا چولا پہنا کر موت کے منہہ میں دھکیل دیتے ہیں جب کہ اِن کے اپنے بچے مزے لُوٹتے ہیں۔ یہ دھرم کی آڑ میں غدودیں بیچتے ہیں۔ اِس لیے تم پریشان ہونا چھوڑ دو۔ ہانڈی اُبلے گی تو اپنے ہی کنارے جلائے گی۔ تم اتنا جذباتی نہ ہوا کرو۔ اللہ پر توکّل رکھو کیوں کہ توکّل کے پھل میٹھے ہوتے ہیں۔ پھر بڑے بزرگ بھی تو کہتے ہیں کہ موقع، وقت پہچانیے، کوئی بکے گالیاں، مُسکرا کے ٹالیے۔''

''پر کیوں؟ ہم کب تک اِن کی زیادتیاں برداشت کرتے رہیں۔ کب تک اِن کی نفرت کو سہتے رہیں۔ کب تک اِن کی چُھری کے نیچے سانس لیتے رہیں۔ کب تک اُداسی اور کسم پُرسی کی یخ بستہ راتوں میں ٹھٹھرتے رہیں۔ ہمارے چُولہے آگ نہ گھڑے پانی ہے۔ ہم اپنی بدحالی میں پیچ در پیچ اُلجھے ہوئے ہیں لیکن ہماری جیون گُتھی سلجھتی ہی نہیں۔ ہم صرف پیٹ کے لیے سوچنے پر مجبور ہیں کیوں کہ ہمیں چڑیا کی چوگ کا چودھواں حصہ بھی نہیں مِلتا۔ ہمارے برتن خالی رہیں اور یہ مٹھائیاں کھائیں۔ انڈے سیوے فاختہ اور کوّے بچے کھائیں۔ یہ ہم پر نت نئے الزام لگاتے رہتے ہیں۔ اپنی کمزوریوں کے ٹھیکرے ہمارے سروں پر پھوڑتے رہتے ہیں۔ یہ ہمیں ذلیل کرتے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

رہتے ہیں۔ نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہیں اور ملامت کے نشتر چبھوتے رہتے ہیں۔ یہ ہمیں شکر تو نہیں دے سکتے مگر میٹھی بات بھی نہیں کرتے۔ اِس لیے ہمیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہوگا۔ ہمارے جانبازوں نے سر پر کفن باندھ کر جہاد کا جو راستہ چُنا ہے وہ ہی مسئلہ کا حل ہے کیوں کہ دُنیا طاقتوروں کو مانتی ہے اور کمزوروں کو لعنت ملامت کرتی ہے۔ پھر زمانے نے بھی ہمیں سِکھا دیا ہے کہ ناتواں کا کوئی یار نہیں ہوتا۔''

''ضمیر احمد! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیوں اپنی ہی لگائی آگ میں جل رہے ہو۔ آگ اور خون کے دریا میں موت کا کوئی گواہ نہیں ہوتا۔ تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ برف، کہرا اور یخ ایک ہی چیز کے تین نام ہیں جو سورج کی تپش سے پگھل جاتے ہیں۔ اِسی طرح اِنسان الگ الگ ذاتوں، عقیدوں، دھرموں اور خاندانوں میں بٹنے کے باوجود بھی اِنسان ہی رہتا ہے۔ ایسے ہی زندگی اور موت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اِس لیے اپنے من پر قابو رکھو۔ امن وسکون رکھو اور صبُوری کی چُوری کھاؤ۔ صابر کا رب سنگی ہوتا ہے۔ باقی اچھے بُرے لوگ یہاں بھی ہیں اور وہاں بھی۔ ہر کوئی صوفی صافی نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر کوئی سادھ سادھو ہوتا ہے۔ انتہا پسندی کے چُولہے میں جنُونی لکڑیاں جلانا مذہبی ٹھیکیداروں کا پیشہ ہے۔ کبھی بابری مسجد کو اُچھالا جاتا ہے تو کبھی گُجرات کو۔ کبھی اکشر دھام کو اور کبھی رام مندر کو۔ معصوم اور بے گُناہوں کا قتل یہاں بھی ہوتا ہے اور وہاں بھی۔ سبھی سیاست کھیلتے ہیں لیکن قبرستان اور شمشان سب کے لیے برابر ہیں۔ اِس لیے میرے بھائی، اپنی سوچ بدلو۔ زبان کے آگے کھائی اور کھُو سب برابر ہیں اور پھر اپنی کھاٹ کے نیچے بھی جھاڑو پھیرا کرو۔ ضمیر احمد! ہر کوئی اپنے کسب کا چور ہوتا ہے۔ اِس لیے اللہ پر بھروسہ رکھو۔ جس نے سانس دیا ہے وہ روٹی بھی دے گا۔ صرف حیلہ کرنے کی ضرورت ہے وسیلہ ملے گا کیوں کہ حیلے رزق اور

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بہانے موت۔ آندھی جب آتی ہے تو اپنے ساتھ بارش بھی لاتی ہے۔ خُدا سب کا داتا ہے۔ جب مولا راضی تو پھر کیسی محتاجی۔ اِس لیے اپنے منہہ سے زہر نہیں اُگلا کرو۔ سیانے کہتے ہیں کہ جو زبان زہر اُگلے اُس کا کاٹ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ پھر چاہے وہ اپنی ہو یا پرائی۔''

''پر حضور کالے کبھی سفید نہیں ہوتے، چاہے اُنھیں سو من صابن لگاؤ۔ پھر ان کا چولہا بھی اپنا اور چوکی بھی۔ یہاں پر جاتنتر کے نام پر ڈھونگ رچایا جاتا ہے۔ صرف ٹھگ اور ٹھگی ہوتی ہے۔ جس کے پلّے نوٹ ہوں ووٹ اُسی کے ہوتے ہیں۔ یہ پھوٹ ڈال کر لوٹ مچاتے ہیں اور راج دھرم نہیں نبھاتے۔ یہ دوسروں کی موری میں اُنگلی ڈالنے سے باز نہیں آتے۔ یہ بڑے جابر ہیں اور جابروں سے دوستی کیسی اور پھر جب رنگ نہ ہو تو سنگ کیسا۔''

''ضمیر احمد! تم ہمیشہ اُوٹ پٹانگ باتیں کرتے رہتے ہو۔ تمہارا دماغ شیطان کی بیٹھک ہے۔ اِس لیے یہ فضول بکواس بند کرو اور کل پاڈر چلنے کی تیاری کرو۔ ڈاکٹر الطاف اور تم میرے ساتھ پاڈر چلو گے۔ غریبی کی سطح سے نیچے رہنے والے لوگوں کے لیے یاک، چنوّرا اور چنوری، جرسی گائے اور خچّروں کی خرید کے لیے جموں و کشمیر بنک کی پاڈر شاخ نے پچاس کیس منظور کیے ہیں۔ ضلع ترقیاتی کمشنر کی جانب سے سرکاری امدادی رقم بھی مل چکی ہے۔ راستہ دشوار ہے۔ اِس لیے ہم جیپسی میں جائیں گے۔''

ضمیر احمد بھدرواہ کا رہنے والا ہے۔ بھدرواہ ایک خوبصورت گھاٹی ہے۔ یہاں کے لوگ خوبصورت، محنتی اور پڑھے لکھے ہوتے ہیں مگر یہ عقلمند کئی بار کم عقلی کی باتیں کرتے ہیں اور اکثر ہندو اور مُسلمان کی ڈفلی بجاتے رہتے ہیں۔ اِن میں ضمیر احمد بھی ہے جو فرقہ پرستی کی آگ بھڑکانے میں پیش پیش رہتا ہے۔ وہ ملی ٹینٹوں کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کارنامے بڑے فخریہ انداز میں سُناتا ہے۔ ایک دِن کہنے لگا:

''جناب! کل فوج نے ہمارے محلّے کی ناکہ بندی کی تھی۔ میرے گھر کے ساتھ ہی دوسرے گھر میں مجاہد ٹھہرے ہوئے تھے۔ دو افغانی دو پاکستانی اور چار کشمیری۔ کشمیر کو آزاد کرانے کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کو تیار یہ مجاہد اُس گھر میں رات گُزارنے کے لیے آئے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد سونے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ پاس میں رہنے والے ایک کافر نے مُخبری کر دی۔ فوج نے مکان کو گھیر لیا اور پورے محلّے کی تلاشی لینی شروع کر دی مگر آفرین ہے اپنے مجاہد بھائیوں پر۔ اُنہوں نے بڑی دلیری کے ساتھ فوجیوں کا مقابلہ کیا اور اندھیرے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے فوجی گھیرا بندی توڑ کر بھاگ نکلے۔ جناب! بہشتی رُوحیں موت سے نہیں ڈرتیں۔ صاحب! وہ کوتوال ہے نا ہمارے بلاک افسر کا بھائی۔ کٹر فرقہ پرست ہے۔ اُس کا بس چلے تو ہمیں گولیوں سے بھون ڈالے۔ اُس کے باپ نے بھی سن سنتالیس کی شورش میں ہمارا قتلِ عام کروایا تھا۔'' اِس طرح کی باتیں سُن سُن کر میرے کان پک گئے ہیں لیکن ضمیر احمد جیسے لوگوں کی کالی زبانیں نفرت آمیز باتیں کرتے تھکتی نہیں ہیں۔ اِنسانی لاشوں کو دیکھ کر اِن کی آنکھیں جھپکتی نہیں ہیں۔

پاڈر ضلع کشتواڑ کا ایک بلاک ہے جو ہماچل پردیش کے ضلع چمبہ کی پانگی گھاٹی کے ساتھ مِلتا ہے۔ عاشقوں کا دریا چناب بھی پانگی سے ہی پاڈر میں داخل ہوتا ہے۔ پاڈر نیلم کی کھان کے لیے بھی ساری دُنیا میں مشہور ہے مگر لوگ غُربت کی چکّی میں پِس رہے ہیں۔ سرکاری امداد اور بنک قرضہ کی وجہ سے لوگوں کی مالی حالت سُدھارنے کے لیے دُودھ دینے والے مویشی یاک، جرسی گائیں، چنّو روغیرہ خرید کر کے پاڈر نواسیوں کو دیئے گئے۔ کام پورا ہونے کے بعد ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا اور شام ڈھلے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کشتوار پہنچ گئے۔ ڈاکٹر الطاف اور ڈرائیور تیج رام کا کہنا تھا کہ رات کشتواڑ میں ہی گزاری جائے، کیوں کہ رات کا سفر خطرے سے خالی نہیں ہے۔ فوجی جوان اور ملی ٹینٹ اکثر رات کو گھات لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ اِس لیے وہ صبح چلنے پر زور دے رہے تھے جب کہ ضمیر احمد کا کہنا تھا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت ہے اور نو بجے تک ہم سب ڈوڈہ پہنچ جائیں گے۔ گھر جلدی پہنچے کے لالچ میں ہم نے ضمیر احمد کی بات مان لی اور پھر ہماری جپسی ڈوڈہ کی طرف دوڑنے لگی۔ ابھی ٹھاٹھری سے کوئی چار کلومیٹر آگے ہی پہنچے ہوں گے کہ سڑک کے بیچوں بیچ فوجی وردی میں ملبوس دو ہتھیار بند جوانوں نے ڈرائیور تیج رام کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ تیج رام نے جپسی روکی۔ دونوں فوجی جوان ہمارے پاس آئے۔ وہ ہمیں گھورنے لگے۔ پھر اُن میں سے ایک بولا:

''سبھی اپنی اپنی سیٹوں پر شناختی کارڈ، بٹوے اور دوسرے کاغذات رکھ کر جیپ سے نیچے اُتر آؤ۔''

ہم نے اُنھیں بتایا کہ ہم سرکاری ملازم ہیں اور پاڈر سے آرہے ہیں لیکن اُنہوں نے ہماری بات پر کوئی دھیان نہیں دیا اور جپسی کی سیٹوں پر پڑے شناختی کارڈ اور دیگر کاغذات دیکھنے لگے۔ پھر اُن میں سے ایک فوجی سارے کاغذات، بٹوے اور شناختی کارڈ لے کر پہاڑ کی طرف چلا گیا۔ ہم نے سمجھا کہ وہ ہماری فوج کے سپاہی ہیں اور ہماری شناخت سے متعلق پوری طرح مُطمئن ہونا چاہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد لمبے بالوں اور اُونچے قد والا ایک خوبصورت جوان پٹھانی لباس میں پہاڑی سے نیچے اُترا اور ہمارے پاس آیا۔ اُس کے ساتھ چار جوان اور بھی تھے۔ وہ کبھی پشتو اور کبھی اُردو میں بات کر رہے تھے۔ اُن کی باتوں سے ہمیں پتہ چل گیا کہ ہم ملی ٹینٹوں کے نرغے میں پھنس چکے ہیں، جنہوں نے فوجی وردیاں پہنی ہوئی ہیں۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''تمہارا نام کیا ہے؟'' ''ارقم چودھری''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' ''میرا نام ڈاکٹر الطاف ہے۔''

''تمہارا؟'' ''میرا نام ضمیر احمد ہے۔'' نام بتاتے ہوئے ضمیر احمد کے چہرے پر خوشی اور جوش جھلک رہا تھا۔

''اِس بات کا کیا یقین ہے کہ تم مُسلمان ہو۔ چلو ایک ایک کر کے سارے کلمے سُناؤ۔ ہم تینوں نے دو دو کلمے سُنائے، لیکن ضمیر احمد کہنے لگا ''حضور! آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ کچھ دِن پہلے آپ بھدرواہ کے قلعہ محلّہ میں جان محمد کے گھر کھانا کھا رہے تھے۔ وہاں آپ سے مُلاقات ہوئی تھی۔ جان محمد میرا موسیرا بھائی ہے۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ یہ چوتھا آدمی کون ہے۔ اوئے! تمہارا نام کیا ہے؟''

''مہاراج میرا نام تیج رام ہے اور مَیں اِس جیپسی کا ڈرائیور ہوں۔'' تیج رام نے ڈرتے ہوئے کہا۔ وہ سہما ہوا تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔

''اچھا، تو تم کافر ہو۔ تمہیں تو ہم نہیں چھوڑیں گے۔ گُل زمان! خنجر لاؤ۔ اِس کی گردن کاٹنی ہے۔ مَیں اِس کو مارنے کے لیے گولی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔''

''امیر! ابھی لایا سرکار۔'' موت کو سامنے دیکھ کر تیج رام رونے لگا اور امیر کے پاؤں پر گر کر منّت سماجت کرنے لگا۔

''سرکار مجھے نہ مارو۔ میری جان بخشی کر دو۔ میری پانچ بیٹیاں ہیں۔ اُن کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں۔ اُن کی پڑھائی، شادی، مجھ پر بڑی ذمہ داریاں ہیں اور مَیں کمانے والا اکیلا ہوں۔ اِس لیے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے چھوڑ دو۔ حضور میرا گھر برباد ہو جائے گا۔ میری بچیاں در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جائیں گی۔ اُن کا کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ وہ بھیک مانگنے لگیں گی۔ مجھ پر ترس کھائیں۔ پرماتما۔۔۔ نہیں نہیں اللہ آپ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کا بھلا کرے گا۔"

"کمانڈر! اِس پر رحم کھانے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ کافر ہے۔ بے دین ہے۔ اِس لیے اِس کا سر دھڑ سے الگ کر دو۔" دوسرا ملی ٹینٹ بولا۔

"یہ خُدا کو چھوڑ کر پتھروں کی پوجا کرتے ہیں۔ اِن کے فوجی ہماری قوم پر ظلم کرتے ہیں۔ ہماری بہو بیٹیوں کی عزّت لوٹتے ہیں۔ سُہاگنوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم بناتے ہیں۔ اِس لیے اِس کی گردن پر خنجر پھیر دو۔ اِس کو بخشنا اور معاف کرنا گُناہِ کبیرا ہے۔ جلدی کرو۔ اللہ کا نام لو اور اِس کا کام تمام کر دو۔"

ملی ٹینٹوں کی آپسی بات چیت میں تیج رام کی زندگی کی پرچھائیں کبھی گھٹتی اور کبھی بڑھتی تھی۔ وہ کانپ رہا تھا اور روئے جا رہا تھا۔

"جناب! اِس کو بخش دیں۔ یہ بالکل سچ بول رہا ہے۔ اِس غریب پر رحم کھائیں۔ اِسے نہ ماریں۔"

"بکواس بند کرو۔ تم اِس کے مامے لگتے ہو، کُتّے کہیں کے۔" ایک آتنک وادی بولا۔

"امیر وقت برباد مت کرو۔ ہم نے دوسرے مشن پر بھی جانا ہے۔ اِس مردُود کو جلدی جہنم رسید کرو۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم تیج رام کو نہیں مار سکتے۔ اِس معصوم بے گُناہ نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ نہتے اور کمزور کو مارنا کِس مذہب میں لِکھا ہے۔ خُداوند کریم تو ربّ العالمین ہے۔ وہ صرف مُسلمانان کا رب نہیں ہے۔ ہم سب مٹّی کے پُتلے ہیں اور آدم کی اولاد ہیں۔ ہم سب کا خون ایک جیسا ہے۔ ہمیں اِنسانی روپ خُدا نے بخشا ہے۔ تم خُدا کی خلقت کو مارنے والے کون ہوتے ہو۔ تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ خلقت

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کو دُکھ دینے سے خُدائی قہر نازل ہوتا ہے۔ تم لوگ نفسیاتی غُلامی کا شکار ہو اور انتہا پسندوں کا ہتھیار ہو۔ تمہاری زبان کڑوی ہے اور تمہارے دِل پتھر۔ تم ممبر کی لکڑی ہو، نہ جلانے کے قابل، نہ بیچنے کے لائق۔''

''اوئے بد بخت! ہم تمہیں کافروں کی غُلامی سے آزاد کرانے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ہم یہاں قُرآن اور شریعت کا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں اور تم اِس کافر کی طرف داری کر رہے ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔''

شرم تو تم لوگوں کو آنی چاہیے۔ تم اِن کو کافر کہتے ہو، لیکن کیوں؟'' کافر تو وہ ہوتا ہے جو خُدا کی ہستی سے مُنکر ہو۔ مگر یہ لوگ تو اللہ کی ذات کو کئی شکلوں صورتوں میں مانتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کو پرماتما، ایشور اور اوم کے ناموں سے پُکارتے ہیں۔ ہماری طرح اِن کا بھی عقیدہ ہے کہ یہ دُنیا یا سرشٹی خُدا نے بنائی ہے اور اِسے چلانے والا صرف ایشور ہے۔ پھر یہ کافر کیسے ہوئے۔ تمہارے شِدّت پسند آقاؤں نے یا تم نے وید نہیں پڑھے۔ جو ہزاروں سال پُرانے ہیں اور جن میں اِنسانی عقل کو حیران کرنے والی باتیں درج ہیں۔ پھر ہمیں ایسی آزادی ہرگز قبول نہیں جس میں دوسرے مذاہب اور عقیدوں کے ماننے والوں کو اپنی مرضی کے مطابق جینے کا حق نہ ہو۔ ہم بھیڑیوں کے جنگل میں نہیں رہتے۔ ہم اِنسان ہیں اور اِنسانیت کے اصولوں کے مطابق زندگی جینا چاہتے ہیں۔ ہم خُدا سے ڈرنے والے لوگ ہیں۔ تم بھی اللہ سے ڈرو۔ موت ہندو یا مُسلمان نہیں دیکھتی۔ موت جہادی یا فسادی نہیں دیکھتی۔ موت دیش بھگت یا دُشمن نہیں دیکھتی۔ خنجر اور بارُود بے شک بڑے سنگدِل اور بے رحم ہیں لیکن دِل تو پتھر نہیں ہوتے۔ اِن میں زندگی دھڑکتی ہے۔ تمہیں لڑنا ہے تو ظُلم کے خلاف لڑو۔ نفرت کے خلاف لڑو۔ اپنے اندر کے دُشمن کے خلاف لڑو اور ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔''

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''امیر! یہ سالا خبیث بہت زیادہ بکواس کر رہا ہے۔ اِس کے سینے میں بھی گولی اُتار دو۔ اِس کی باتوں کی طرف نہ جاؤ۔ بات باتوں میں گئی تو بات گئی۔ اِس لیے اِس کافر کی گردن پر چُھری پھیرو اور ثواب کماؤ۔''

تمہارے ثواب نے ہماری زندگی عذاب بنائی ہوئی ہے۔ تم نے نہیں دیکھا کہ زمین سے گھاس اُگتی ہے اور گھاس بھیڑ بکریاں چٹ کر جاتی ہیں۔ بھیڑیے بھیڑ بکریوں کا شکار کرتے ہیں۔ گینڈے بھیڑیوں کو پھاڑ دیتے ہیں۔ شیر گینڈے کو چیر دیتا ہے۔ موت شیر کو ختم کر دیتی ہے اور یہ سِلسِلہ چلتا رہتا ہے اِس لیے طاقت کا کوئی وجود نہیں۔ تم غفلت میں نہ رہو۔ طاقت کا ثبوت یہ نہیں کہ تم نہتے اور بے گُناہ لوگوں کو مارو بلکہ طاقت کا مطلب اپنے نفس پر قابو پانا ہے۔ اپنی نفرت اور لالچ کو مارنا ہے۔ ہمارے نبی کریم کی حدیث ہے کہ جو کوئی مُسلمان کسی غیر مُسلم کو ناحق قتل کرے گا وہ دوزخ میں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ زمین پر رہنے والی مخلوق پر رحم کرو۔ اللہ تم پر رحم فرمائے گا۔ تم بے شک مجھے گولی مار دو مگر مَیں تیج رام کو مرنے نہیں دُوں گا۔ میری سوچ کے مطابق سچ اور حق بات کہنا ہی سب سے بڑا جہاد ہے۔''

اِتنی دلیری اور بے خوفی سے اپنی بات کہنے والے اور تیج رام کو بچانے کے لیے اپنی جان تک دینے والے شخص کو مَیں بڑی حیرانی سے دیکھے جا رہا تھا کیوں کہ یہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ ضمیر احمد تھا جس کا آج مَیں ایک نیا رُوپ دیکھ رہا تھا۔ امیر نے دو رکعت نفل پڑھے اور پھر تیج رام کو گھورنے لگا۔ تیج رام کی آواز بند ہو چکی تھی۔ وہ امیر کی طرف بڑی بے بسی اور بے چارگی سے دیکھ رہا تھا۔ امیر تیج رام کی طرف بڑھا۔ اُس نے تیج رام کے شانوں پر ہاتھ رکھا اور اُسے تیکھی نظر سے دیکھنے لگا مگر مُنہ سے کچھ نہ بولا۔ تیج رام کے ہونٹ سوکھ چکے تھے۔ اُس کا جسم ٹھنڈا پڑ چُکا تھا۔ اُس کی سانس

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اُکھڑی ہوئی تھی۔ امیر کے چہرے پر ہلکی سی مُسکان اُبھری اُس نے تیج رام کے ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑا۔ پھر اُس کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔ تیج رام کی آنکھوں میں تھوڑی سی چمک آئی۔ اُسے زندگی پھر انگڑائیاں لیتی ہوئی محسوس ہوئی۔ امیر نے تیج رام کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ پھر وہ ہماری طرف مُڑا۔ وہ مُسکراتا رہا۔ اُس نے ہم تینوں سے ہاتھ ملائے اور اپنے ساتھی کو ہمارے شناختی کارڈ اور بٹوے لوٹانے کا حکم دیا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دیوار پر لکھے حرف

یار اگنی شیکھر! مجھے بتانا کہ اِن ہمسایوں میں یہ تُو تُو، مَیں مَیں کیوں لگی رہتی ہے۔ اِتنا لمبا عرصہ گزر چُکا ہے لیکن اِن کی دُشمنی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اِن کے ماتھے پر پڑی نفرت کی لکیریں ٹوٹنے کا نام تک نہیں لیتیں۔ اِن کی مکاریوں نے قہر برپا کیا ہوا ہے۔ گرم آلود موسم نے اندھیر گردی مچائی ہے۔ تُند و تیز ہوائیں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں۔ ظُلم و جبر، نفرت و عداوت اور درد و الم کے کارن لوگوں میں ہاہا کار مچا ہوا ہے۔ آگ کے شُعلوں سے دھرتی جل رہی ہے۔ پھر بھی اِن کی ہنکر نہیں ٹُوٹتی۔ لوگوں کا درد اِن کی بے دردی کی وجہ سے ہے۔ کبھی یہ دونوں سانجھے آنگن کے باسی تھے۔ سانجھی تہذیب اور مشترکہ سبھیا چار کے وارث تھے۔ پھر اِن میں پھوٹ پڑ گئی اور زمین جائداد آپس میں تقسیم ہو گئی۔ مگر کم عقلی اور اُلٹی کھوپڑی کی وجہ سے یہ پھر بھی مطمئن نہیں ہوئے۔ شریکے چاری، ریا کاری اور نفرت کی وجہ سے یہ ایک دوسرے پر فِقرے کستے رہتے۔ اِلزام تراشیاں کرتے رہتے اور جھگڑتے رہے۔ دیکھنے میں تو اِن کی خوبصورت داڑھیاں، ماتھے پر کیسری ٹیکے اور سر پر نمازی ٹوپیاں بہت اچھی لگتی تھیں، لیکن اندر سے یہ کالے بگلے بھگت تھے۔ اِنہوں نے کبھی ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کیا۔ سرپنچوں اور نمبرداروں نے اِن کی الزام تراشیوں پر کئی بار غور کیا اور اِنہیں پھٹکار بھی لگائی مگر پھر بھی اِن کی دُشمنی ختم نہیں ہوئی۔ فساد اور تضاد ختم نہیں ہوا۔ اعتماد اور اتحاد روٹھے رہے۔ اِن

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دونوں گمراہوں کو سیدھا راستہ دِکھائی نہیں دیتا۔ یار اگنی شیکھر! کیا تم بتا سکتے ہو کہ اِن کے درمیان اصل مسئلہ کیا ہے؟''

''میری سوچ کے مطابق یہ فساد اُس پھولوں والے باغ کا ہے جو دونوں نے آپس میں طاقت کے زور پر بانٹا ہوا ہے اور دونوں سارے باغ کی مالکی اپنے نام لگوانا چاہتے ہیں۔ جبھی تو لڑتے مرتے رہتے ہیں۔'' اگنی شیکھر نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''تمہاری بات میں تھوڑا دم ہے لیکن میرا ماننا ہے کہ دونوں دھرم بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور مذہبی جنون میں اندھے ہو گئے ہیں۔ تنگ نظری اور اندھے عقیدوں نے اِن کے دِل و دماغ پر سیاہی پھیری ہوئی ہے۔ اُنہیں پیار، محبت، نیکی اور اچھائی نظر ہی نہیں آتی جس کی وجہ سے اِن کی عقل گُم ہو گئی ہے۔ آؤ! ہم دونوں مل کر اِن کے لیے عقلِ لطیف ڈھونڈ کر لائیں۔ انہیں سانجھ پریت کی بات سمجھائیں۔ رُوح قلبوت کا پاٹھ پڑھائیں اور موٹے لفظوں میں کانٹے دار تار سے سجی دیوار پر لکھیں کہ ''اِس تقسیم شُدہ آنگن کے پیڑ کی جڑیں سانجھی ہیں''۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بھوک کو بھوجن کیا

گلابو کی بیٹی لاجو موج مستی کرتے جب تیسری بار پکڑی گئی تو گلابو بے چاری لاج سے مرگئی۔

اُس کے لیے تو لاجو ہتھیلی کا چھالا بن گئی تھی۔ ایک بار پھر پورے گاؤں میں لاجو کی باتیں ہونے لگیں۔ ساری ساری رات گلابو اِس سوچ میں ڈوبی رہتی کہ اپنے گلے کا یہ گھینگا کیسے کاٹا جائے۔ یہ پھٹا ہوا ڈھول کس کے گلے مڑھا جائے۔ سارے گاؤں میں وہ مُنہہ دِکھانے کے لائق نہیں رہی تھی۔ ذات برادری والے اُٹھتے بیٹھتے آوازے کستے رہتے کیوں کہ لاجو نے ماں کو تھوک لگا کر چھوڑا تھا۔ وہ سوچتی کہ آج اگر لاجو کا باپ زندہ ہوتا تو نہ یہ کیچڑ اُس پر اُچھالا جاتا اور نہ ہی کوئی بدبو پھیلتی لیکن گلابو کا گاماں بھی کوئی فرشتہ نہ تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا ''باہر میاں لکھ ہزاری، اندر بیوی قہر کی ماری'' والا حساب تھا۔ گاماں بے شک ایک بڑھیا مستری تھا لیکن اِس کی ساری کاریگری شراب کی بوتل میں گُھل کر بازیگری کرنے لگتی اور گرہستی کی گاڑی چلانے کے لیے جب بھی گلابو پیسے مانگتی تو گاماں گالیوں کا جھاڑ باندھنے کے ساتھ گلابو کے جسم کی چولیں بھی ہِلا کر رکھ دیتا۔ پھر بھی کوئی ایسی بات تھی کہ گلابو نے گامے کے ساتھ ایک کھٹا میٹھا سا رشتہ آخری دم تک قائم رکھا۔ گامے کے مرنے کے بعد گلابو نے لاجو کو کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ یتیم ہوگئی ہے۔ اُس نے حالات کا مقابلہ مردانہ وار کیا اور

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بڑے لاڈ پیار سے لاجو کو پالا۔ بھلا گائے کو کبھی اپنے سینگ بھی بھاری لگے اور پھر کہتے ہیں نا کہ ''باپ گھوڑی پر چڑھا کھوٹا اور ماں بھیک مانگتی اچھی۔'' پر گلابو نے کبھی بھیک نہیں مانگی۔ وہ سارا سارا دِن کلونتے چودھری کے کمبل بُننے کے کارخانے میں کرگی چلاتی اور لاجو ماں کے گھر آنے تک گاؤں کے مشٹنڈوں سے آنکھیں لڑاتی رہتی۔ ایک تو بالی عمر دوسرا کوئی روکنے والا بھی نہیں۔ سانولے رنگ کی سانولی لاجو، آنکھیں جیسے مست شرابی اور انگ انگ میں جوبن کی ترنگ۔ اُس کی شوخ طبیعت کی شوخیاں اپنا رنگ دِکھانے لگیں اور وہ اپنے وجود کی آگ کو سر پر اُٹھائے بھاگنے لگی۔

لاجو پہلی بار کلونتے چودھری کے بیٹے بنتے کے ساتھ بھاگی جو اُسے امرتسر میں امرت پلانے کے بعد ساتویں دِن گھر لے آیا۔ دوسری بار وہ گاؤں کے کمپاؤنڈر سرنے بابو کے ساتھ چلی گئی۔ وہ اُسے کشپ رشی کی وادی میں سیر کرانے لے گیا تھا اور اب تیسری بار وہ دِلی سے پکڑی گئی تھی۔ دِلی اُسے کالیا پہلوان لے گیا تھا۔ فلم ایکٹرس بنانے اور چاندنی چوک کی آؤٹ ڈور شوٹنگ میں لال پگڑی والوں نے اُسے دبوچ لیا تھا۔ چودھری رحیم بخش کو جب لاجو کے گھر واپس آنے اور گلابو کی گُنجلک کی خبر ملی تو وہ گلابو کے گھر اپنے بیٹے کا رِشتہ مانگنے چلا گیا اور کہنے لگا ''بہن! بچھیری بھوکی ہے اور بھوسا سڑا ہوا۔ اگر تمہاری مرضی ہو تو اللہ بسم اللہ۔''

چودھری رحیم بخش کا بیٹا جو اُس کی ساری جائداد کا اکیلا مالک تھا دراصل اُس کے اپنے نُطفے سے نہ تھا۔ جبھی تو چودھری نے اُسے سڑا ہوا بھوسا کہا تھا۔ کریمے نے اختری بائی کی کوکھ سے جنم لیا تھا اور فقیر کی جھولی میں خُدا جانے کِس کِس نے خیرات ڈالی تھی۔ سارا گاؤں اِس حقیقت کو جانتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کریما تیس سال کا ہوتے ہوئے بھی ابھی تک کنوارہ تھا۔ کریمے کی جوانی کا کیا کہنا۔ دودھ کی ملائی اور کاہگانی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بکروں کے پائے کھا کھا کر بھی وہ جوبن پر آنے کو ہمیشہ شرماتی رہی۔ چودھری نے اُس کی صحت بنانے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن سیانے کہتے ہیں نا کہ ''ٹٹوا کھا گیا بٹوا پھر ٹٹوے کا ٹٹوا۔'' کریما بیچارا مُنہہ چُوہی اور پیٹ کھوئی ہی رہا لیکن اِس میں کوئی شک نہیں کہ چودھری کی صحت کمال کی تھی۔ اُسے دیکھ کر تو کہنا پڑتا تھا کہ وہ ساٹھے کا پاٹھا تھا۔ ویسے بھی وہ بڑی رنگیلی طبیعت کا مالک تھا۔ اُس کی یاری گاؤں کے چھوٹے بڑے سب کے ساتھ تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی بات کی بسم اللہ ایک موٹی مگر میٹھی سی گالی سے کرتا۔ کشمیری سِلک کا کُرتا، مُلتانی ریشمی لاچا، قصوری تِلّے دار جوتی اور سر پر پٹھانی کُلھے دار پگڑی باندھ کر جب وہ پنچایت میں بیٹھتا تو اکثر اپنی مردانگی کے قصے سُناتا۔ میاں بیوی کے جھگڑوں کا فیصلہ سُناتے ہوئے وہ کئی بار فخر سے کہتا:

''اوئے! رنڈی سے بیاہ کیا ہے۔ پچیس برس سے میرے گھر میں ہے۔ کیا مجال جو ایک بار بھی میری اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم رکھا ہو۔ ہے نہ قابو میں رکھی ہوئی'' اور یہ بات دُرست بھی تھی۔ کوٹھا چھوڑنے کے بعد اختری بائی جس دِن سے چودھری رحیم بخش کی زوجیت میں آئی تھی اُس کے باقی کے سبھی رشتے ٹوٹ گئے تھے۔ صرف ایک ہی رشتہ رہ گیا تھا۔ چودھری سنگ پیار کا رشتہ جو مرتے دم تک قائم رہا۔ چودھری کی لاکھ کوششوں کے باوجود اختری بائی کی کوکھ دوبارہ ہری نہ ہوسکی۔ وہ پھر سانچے کی سچی نہ بن سکی۔ تھک ہار کر چودھری نے کریمے کو اپنا مُتبنّیٰ بنا لیا۔ لاجو کی کرتوتوں سے گلابو بڑی نادم اور شرمسار تھی اور جب چودھری کریمے کا رشتہ لے کر آیا تو اُس نے شُکر کا کلمہ پڑھا اور موقعے کو غنیمت جانتے ہوئے ہاں کر دی۔

کریمے اور لاجو کا بیاہ ہو گیا اور بڑے ٹھاٹھ سے ہوا۔ کہتے ہیں کہ اختری بائی نے بارات والے دِن اپنے ہاتھوں سے چودھری کو انگوری پلائی تھی اور کوٹھے کی یادیں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

تازہ کرتے ہوئے دو چار گھونٹ خود بھی پی لی تھی۔ وہ بڑی خوش تھی۔ کیوں نہ ہوتی۔ اُس کا جال دار کبوتر ڈولی گھر لے کر آیا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ مُرغ چاہے رنگ برنگے ہوں پر بانگ ایک سی ہوتی ہے۔

بھوکی بچھیری سڑا ہوا بھوسا کھانے لگی۔ بھلا بھوک کو ذائقہ کیا اور نیند کو بستر کیا۔ وہ گابن بھی ہوئی لیکن اُس کے بچھیرے کو دودھ پینا نصیب نہ ہوا۔ یہ سلسلہ کوئی زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ جلد ہی لاجو کریہے سے اُکتا گئی۔ جسے سبز چارہ چرنے کی عادت ہو، وہ سڑا ہوا بھوسا بھلا کتنے دِن تک کھا سکتی تھی۔

لاجو جٹّے درزی کے لڑکے برکت کے ساتھ آنکھیں لڑانے لگی۔ ایک دِن چودھری کی نظر پڑی تو اُس نے لاجو کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا۔ لاجو نے اُس کی غیرت اور عزت کو للکارا تھا۔ لاجو جس گھر کی مٹی تھی وہیں جا پہنچی۔ تھوڑے دِنوں بعد جب چودھری کا غُصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ لاجو کو لینے آیا۔ لاجو نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور چودھری کو اُسی طرح بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا جس طرح اُسے نکالا گیا تھا۔ پھر کچھ مُدّت بعد گاؤں والوں نے سُنا کہ لاجو ایک بار پھر فلم ایکٹرس بننے چلی گئی ہے کالیے پہلوان کے ساتھ اور چودھری آج کل اپنے سڑے ہوئے بھوسے کے لیے کوئی دوسری بچھیری تلاش کر رہا ہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

حلالہ

راجاں کوئی بہتی ہوئی شہتیری نہیں تھی جسے نواب دریا سے پکڑ کر لایا ہو۔ وہ تو بھری بہاروں کی گھنی چھاؤں میں پلی بڑھی، ہنستے بستے گھر کی اولاد تھی اور ماں باپ نے بڑی دھوم دھام سے نواب کے ساتھ اُس کی شادی کی تھی۔ راجاں جب تک کنواری رہی اُس کے خاندان کی عزت کا ستارہ عروج پر رہا۔ اُس کا باپ جمال دین شہر کا سب سے بڑا ٹھیرا تھا اور اُس پر یہ کہاوت صادق نہیں آتی تھی کہ ٹھیروں کی گاگر ٹپکتی رہتی ہے بلکہ اُس کے کاروبار سے گھر میں خوشحالی تھی۔ جمال دین نے بیٹی کو رُخصت کرتے وقت کوئی کنجوسی نہیں کی تھی۔ برتن بھانڈے، کپڑے لتے اور زیور گہنے جی بھر کے دیے تھے۔ جہیز دیکھ کر نواب علی خان کی آنکھیں پھٹنے لگی تھیں۔ اُسے جہیز رکھنے کے لیے اپنی حویلی بھی چھوٹی لگ رہی تھی۔

سہاگ رات کو صندلی رنگ کی راجاں صندل کی گہری خوشبو کی طرح نواب کے دِل میں اُتر گئی تھی۔ اُس کے گالوں پر بہاریں مُسکرا رہی تھیں۔ عنابی ہونٹوں پر مستی کی چکنائی تیر رہی تھی۔ گہری سیاہ زُلفیں جب پھنکارتے ہوئے سانپ کی طرح مخملی تکیے پر بکھریں تو نواب سے رہا نہ گیا۔ وہ اپنے بے قابو من کو گرم گرم سانسوں کی ٹکور دینے لگا لیکن دِل میں بھڑکتے ہوئے شُعلے جب آسمان چھونے لگے تو وہ جلتی ہوئی آگ کو گرم پانی سے بجھانے کے لیے راجاں کے ریشمی بدن کے ساتھ مخملی کمبل میں گھس گیا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

نواب نے تو شاید اپنی آگ کو سرد کر لیا ہو لیکن ٹھنڈے یخ پانی سے نہانے کے باوجود بھی راجاں کے جسم کی آگ نہیں بجھی تھی۔

صبح جب راجاں نے کن انکھیوں سے نواب کو دیکھا تو اُس کا تن من بول اُٹھا کہ اِس مٹی کے پہلوان کی ٹانگیں ریت کی ہیں۔ اُس نے دِل ہی دِل میں نواب کو طعنہ دیا ''بھری جوانی مانجھا ڈھیلا۔'' مگر نواب بھی کیا کرتا۔ وہ تازہ بوسیدہ ایک ہی جیسا تھا۔ راجاں اپنے ماں باپ کی عزت و آبرو کا چولا پہن کر وڈیروں کی حویلی میں آئی تھی اِس لیے وہ صبر شکر کر کے نواب کے ساتھ گزر بسر کرنے لگی اور اپنے عرق میں غرق ہو گئی۔ نواب اُس کے ساتھ میٹھا بولتا اور اُس پر موتی نچھاور کرتا۔ وہ اُسے ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ عورت پہلے ''نر'' اور بعد میں ''زر'' مانگتی ہے۔ بھوک لگنے پر راجاں کو ویسے تو چنے بھی بادام کا ذائقہ دیتے لیکن بادام کھانے سے بھی بھوک کہاں مٹتی ہے۔ راجاں کے بدن کی منہہ بند ہنڈیا جب عشق کی تپش میں اُبلنے لگتی تو بے کرتوت نواب کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو کوستی اور اُس کی پیاس اور بھی ننگی ہو جاتی۔ نواب سمجھتا تھا کہ ''عورت گھر کی رانی اور مرد ڈھوئے بھار'' لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ ''جو عورت کو زیر کرے وہی اُترے پار''۔ راجاں اِس حویلی میں خود کو بندر کے گلے میں موتیوں کا ہار سمجھتی۔ اُس کے لیے نواب کا ظاہر روشن تھا لیکن باطن تاریک۔ اب وہ سوچنے لگی کہ ''میاں تو مر گیا آئی کے ساتھ، بیوی کیوں مرے رضائی کے ساتھ۔'' اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی پیاس کو بن باس نہیں دے گی۔ تھوڑے عرصے میں ہی راجاں کی عقل کا چراغ گُل ہو گیا۔ اُس نے شرم و حیا کا چولا اُتار کر سماج کے منہہ پر دے مارا اور پردے میں اپنی فطری خواہش کی تسکین کے ذرائع تلاش کرنے لگی۔ وہ حویلی کی دہلیز کو پھلاندنا نہیں چاہتی تھی پر حویلی کے اندر اُس کی حالت ایسی تھی کہ ''کوٹھے کی دوڑ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کگار تک۔'' اِس لیے گھر کی بلّی گھر ہی میں میاؤں کرنے لگی۔ اِس میاؤں کے دعوتی انداز کو سب سے پہلے جواد علی نے سمجھا۔ جواد علی نواب علی خان کا چچازاد بھائی اور حویلی کا لاڈلا۔ راجاں جواد میں دلچسپی لینے لگی اور بڑے پیار اور چاؤ کے ساتھ اُسے دیسی گھی کی چُوری کھلانے لگی اور اُس کا من پھُسلانے لگی۔ جواد نے اپنے کنوارپن کی گٹھڑی کی گانٹھ بڑی مضبوطی سے باندھ رکھی تھی لیکن بھرے بھرائے گھر میں راجاں نے وہ گانٹھ کھول دی اور ساری دولت لوٹ لی۔

نواب سارا دِن زمینداری کے کاموں میں مصروف رہتا یا پھر دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے کے لیے چلا جاتا۔ پیچھے سے جواد گھر کی پھلواڑی ہی میں صندلی تیتری کا شکار کر لیتا۔ راجاں کا دِل سمُندر جیسا گہرا تھا اِس لیے نواب اِس سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی لہروں کی کہانی سمجھ نہیں پایا۔ راجاں مُرغی کی طرح خاک اُڑانے لگی اور نواب کے سر پر ڈالنے لگی۔ موقع ملتے ہی راجاں بارش کی طرح جواد پر برستی اور جی بھر کر اُسے بھگوتی۔ بھلا ''رہنے کے لیے گھر ہو اور موج مستی کے لیے نر ہو'' تو پھر عورت کو اور کیا چاہیے۔

دِلوں کے میلے سجنے لگے۔ وہ بہت خوش تھی۔ اب اُس کا ہاتھ برسرِ کار اور دِل یار کی طرف رہتا۔ وہ اب اپنی سانسوں کا صدقہ اُتارتی اور خوب موجیں مارتی۔ جواد جب کبھی بھی اُسے گُناہ اور ثواب کا حساب سمجھانے لگتا تو راجاں اُسے بڑے پیار سے کہتی ''یہ جگ میٹھا، اگلا کِس نے دیکھا۔'' یوں دو مُلّاؤں کے بیچ مُرغی حرام ہونے لگی۔ راجاں روٹیوں کے ساتھ بوٹیاں کھانے لگی۔ وہ خوش تھی کہ ''چاہے موٹیاں ہوں یا چھوٹیاں'' ہیں تو دونوں ایک ہی توے کی روٹیاں۔ اُس کی کوکھ سے ایک لڑکے اور دو لڑکیوں نے بھی جنم لیا۔ پر راجاں کی پوشاک اور خوراک میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ خصم کا کھاتی اور یار کے گُن گاتی اور ساتھ ہی کہتی کہ اپنے گھر میں کوئی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

چھاج بجائے یا چھلنی کسی کو کیا۔

حویلی میں کچھ فاختاؤں کا بھی رین بسیرا تھا جو حویلی کے صحن میں دانہ چگتی رہتیں اور حویلی کی اوٹ میں راجاں اور جواد کو موج مستی کرتے ہوئے دیکھتی رہتیں۔ وہ امانت میں خیانت کرنے کے لیے جواد کو طعنے مارتیں اور راجاں کو کوستیں۔ آہستہ آہستہ نواب کو اِس بات کا علم ہو گیا کہ اُس کے سونے میں کھوٹ ہے۔ وہ راجاں سے پوچھنے لگا:

''مَیں کیا سُن رہا ہوں۔ تُو جواد کے ساتھ۔۔۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔ وہ تیرا دیور ہے، تیرے بیٹے جیسا۔''

''یہ بکواس ہے۔ تم مجھ پر بہتان لگا رہے ہو۔ تمہیں کوئی حق نہیں مجھے اِس طرح ذلیل کرنے کا۔ مَیں اپنے ماں باپ کی لاج رکھتے ہوئے تیرے جیسے ڈھیلے ڈھگے کے ساتھ گزارا کر رہی ہوں۔ پھر بھی تم مجھ پر شک کر رہے ہو۔'' راجاں گرجی۔

''ہاں ہاں تم اب عربی گھوڑے پر سواری کر رہی ہو نا اِس لیے اب مجھے ڈھیلا ڈھگا کہہ رہی ہے پر میری ایک بات سُن لے جس دِن مَیں نے تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اُسی دِن تجھے طلاق دے دوں گا اور چونڈا پکڑ کر حویلی سے باہر نکال دوں گا۔ پھر ٹھٹھیروں کے چوبارے پر بیٹھی کبوتر اُڑاتی رہنا۔'' نواب غُصّے میں اُبل رہا تھا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے، کُتّے بھونکیں تو چاند کو کیا۔''

شک حویلی کے اندر داخل ہو چُکا تھا اور یقین ڈیوڑھی سے باہر نِکل گیا تھا۔ نواب کا دِل اب کسی بھی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ خوشیاں اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ چکی تھیں۔ اُس کی رُوح ویران ہو چُکی تھی۔ وہ بے چین رہنے لگا تھا۔ اُس نے زمینداری کا کام بھی اپنے مُنشی کے حوالے کر دیا۔ اُس نے شکار کھیلنا بھی چھوڑ دیا اور

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

حویلی کی نگرانی پر بیٹھ گیا۔ اُسے اِس بات کا بڑا دُکھ تھا۔ کہ جواد نے اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے لیکن وہ سمجھتا تھا کہ گِدھا کبھی ایک ہاتھ سے نہیں پڑتا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک سُنار کھوٹا نہیں ہوگا، سونا کھوٹا نہیں ہوسکتا۔ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ رنگت دونوں کی سنگت کا نتیجہ ہے۔ اِسی لیے وہ راجاں اور جواد کو جُگل بندی کرتے ہوئے پکڑنا چاہتا تھا۔ جواد کی آنکھ بھی اب اکثر پھڑکتی رہتی۔ اِس لیے وہ اب راجاں سے کنّی کترانے لگا تھا لیکن راجاں بھی ٹھٹھیروں کی کبوتری تھی، ہُش کرنے سے اُڑنے والی نہیں تھی۔ بھلا وہ محبوب کی جُدائی کیسے برداشت کرتی۔ اُسے جب بھی موقع ملتا وہ چھاج کو چھلنی میں چھلتی اور دِلوں میں امرت رس گھولتی۔

راجاں اور جواد کو پیار کی بھنگ پی کر ترنگ میں آتے دیکھ کر اب تو حویلی کے نوکر چاکر بھی نواب کی کھِلی اُڑاتے۔ پھر ایک روز چھاج چھلنی کا کھیل پکڑا گیا۔ جواد کو راجاں کی آغوش میں دیکھ کر نواب کی آنکھوں میں لہو اُتر آیا۔ اُس کے وجود سے آگ کے شعلے نکلنے لگے اور اُس کی زبان پھُنکاریں مارنے لگی۔

''طلاق۔۔۔طلاق۔۔۔طلاق۔۔۔''

جواد بھاگ گیا۔ راجاں نے نواب کے پاؤں پکڑ لیے۔

''مجھے معاف کردو۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میرے ساتھ جواد نے زبردستی کی ہے۔۔۔'' وہ رونے لگی، چلّانے لگی لیکن یہاں اُس کا کوئی نہیں تھا۔ نہ ماں، نہ بہن، پھر کون سُنتا بین۔

''چھنال تُو میری عزت کی لُٹی ہوئی کمائی بن گئی ہے۔ تیری بے حیائی نے حویلی کی غیرت پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ اِس حویلی میں مکھن کھاتے ہوئے تیرے دانت گھِس گئے ہیں اِس لیے تُو یہاں سے دفع ہو جا نہیں تو مَیں تیرے دانت توڑ دوں گا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

مَیں تجھے تین بار طلاق دے چکا ہوں اب تُو میری منکوحہ نہیں ہے۔ اب تُو آزاد ہے۔ اب جا اور سُوروں کو کھجوریں کھِلا۔۔۔''

''میرا کوئی قصور نہیں۔۔۔ مجھے معافی دے دو۔۔۔'' راجاں صفائی پیش کرنے لگی لیکن اندر سے وہ جانتی تھی کہ کنویں میں گِری ہوئی اینٹ کبھی بھی خُشک نہیں نکلتی۔

''چل چل۔۔۔ باہر کا راستہ لے، تُو تو کنجری ہے اور مکھی اور کنجری کبھی اندر نہیں رہتیں۔ تیری جیسی بدچلن بیوی شوہر کے لیے گالی ہے۔۔۔'' وہ راجاں کو دھکے مارنے لگا اور بازو سے پکڑ کر باہر نکالنے لگا۔

''بس نواب بس۔۔۔ تُو نے بہت بکواس کر لیا۔۔۔ تُو نے بہت گالیاں دے دیں۔۔۔ جب تُو نے میرے ساتھ سبھی رشتے ہی توڑ لیے ہیں تو پھر تمہیں کوئی حق نہیں ہے مجھ پر ہاتھ اُٹھانے کا۔۔۔ مجھے بُرا بھلا کہنے کا۔۔۔ مَیں نے جو کیا وہ بھُول بھلیکے، میرے کرم اللہ دیکھے لیکن تُو یہ بتا کہ تیرے پاس کون سا گُن ہے جو تُو اپنی عزت کو رو رہا ہے۔ تیرے پاس تیر ہے نہ کمان پھر تو کہاں کا پٹھان؟ ارے رو تو مَیں رہی ہوں اپنی قسمت کو جو تیرے جیسے بے کرتوت کے پلّے باندھ دی گئی۔ عزت اور شرافت تبھی قائم رہتی ہے جب کسی کے پاس سخاوت ہو۔ تیرے پاس تو کوڑی بھی نہیں پھر تُو کہاں کا سخی۔۔۔؟

راجاں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ وہ سر اُٹھا کر حویلی سے باہر نکل آئی اور پھر سے ٹھٹھیروں کی بستی میں پہنچ گئی۔ راجاں کو دیکھ کر جمال دین کے چوبارے کی دیواریں لرز اُٹھیں۔ جمال دین بہت دُکھی تھا۔ ذات برادری میں اُس کی بڑی رسوائی ہوئی تھی۔ وہ طلاق کو دوزخ کی آگ کہتا جس میں عورت جلتی ہے۔ اِس لیے وہ بڑے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بزرگوں سے بات چیت کر کے راجاں اور نواب کو پھر سے ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ راجاں نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ نواب اُسے طلاق دے دے گا۔ اُسے تو گھر کی کھچڑی کھانے میں مزا آ رہا تھا لیکن اب بھلا وہ کیا کر سکتی تھی۔ شتابی کام خراب کرتی ہے۔ غصہ حرام اور آدمی بدنام ہوتا ہے۔ راجاں اِس سارے معاملے پر غور کر کے مُرجھائی رہتی۔ یوں تو وہ ایک ایسی سیانی بلّی تھی جو ہر طرح کے چوہے دبوچنے کا ہُنر جانتی تھی لیکن اب وہ عمر کے اُس حصے کی طرف گامزن تھی جہاں عورت یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ ''جِس کے پاس گہنا، اُسے بھوکا کیوں رہنا'' اُس کے جسم کے گہنے اب پالش کرنے پر بھی زرد پڑتے جا رہے تھے اور وہ سمجھنے لگی تھی کہ ''چار دِہاڑے شوق کے، پھر وہی کُتے بھونکتے۔'' اُس کی عقل کا چراغ روشن ہو چُکا تھا اور سمجھ کی لَو میں اُس نے دیکھ لیا تھا کہ سبھی چڑھتے سورج کو ہی پانی دیتے ہیں ڈوبتے سورج کو کوئی پانی نہیں دیتا۔ وہ جان چکی تھی کہ ماں باپ حُسن جوانی اور کالی زُلفیں ہمیشہ نہیں رہتیں اور اب تو اُس کے دِل کے کسی کونے میں سوئی ہوئی ماں بھی بیدار ہو چکی تھی جو چاہتی تھی کہ اپنے بچوں کو سینے سے لگائے اور اُنھیں ممتا بھری لوریاں سُنائے۔ اِس لیے اُس نے اپنے باپ جمال دین کی کوششوں کو خارج نہیں کیا۔

وڈیروں کی حویلی ویسے تو کھڑی تھی لیکن نواب کے دِل کی جھونپڑی گر چکی تھی۔ اُس کی تو دُنیا ہی اُجڑ چکی تھی۔ وہ بے حد مایوس تھا۔ وہ اپنے بچوں کو دیکھ کر مُرجھا جاتا اور کہتا۔۔۔ ''بابا فرید، عورتیں ظالم، مرد غریب۔۔۔'' وہ تنہائی کی سولی پر چڑھ کر سوچتا رہتا کہ ''یہ کیسی چلی گرم ہوا کہ اُجڑ گیا تخت ہزارہ۔'' نواب کی شکست وریخت کو دیکھ کر بڑے بزرگ حویلی کے گرد منڈلانے لگے اور نواب کو سمجھانے لگے۔

''معاف کرنا بھی ایک نیکی ہے بیٹا اور اللہ معاف کرنے والوں کا درجہ بلند

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

فرماتا ہے۔۔۔تُو راجاں کو معاف کر دے اور اُس کے ساتھ پھر نکاح کر لے۔ وہ اپنی غلطی پر بہت پچھتا رہی ہے۔ اُس نے بدنامی کی بڑی آگ سینک لی ہے۔ اُسے بخش دے۔ وہ اب تمہاری چادر کو پورا آدر دے گی۔

''پر غفور چاچا! راجاں کی حرام کاری کوٹھے چڑھ کر کُوکی ہے۔ مَیں اپنے شریکوں میں منہہ دِکھانے کے قابل نہیں رہا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ شریک چاہے مٹی کا ہی ہو بہت بُرا ہوتا ہے۔ راجاں نے تو میری عزت مٹی میں ملا دی ہے۔ بدچلن عورت کو تو خُدا بھی ناپسند کرتا ہے، مَیں تو اِنسان ہوں۔ پھر مَیں دوبارہ کیسے کہوں کہ آبلا مجھے مار۔ بزرگو! اَن داتا تو ہر کوئی ہوسکتا ہے لیکن رن داتا کوئی نہیں ہوتا۔''

تیری بات لاکھوں کی ہے بیٹا لیکن بڑے سروں کی پگڑیاں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ اِس لیے تُو فراخدلی کا مظاہرہ کر اور بگڑے ہوئے کام کو سنوار لے۔ تیرے ساتھ ساتھ جمال دین کی بھی بڑی رسوائی ہوئی ہے۔ وہ بھی برادری میں مُنہہ دِکھانے کے قابل نہیں رہا ہے۔ اُس کی عزت کی میلی چادر کو بھی دھوڈال۔ اُس کا مان بھی رکھ لے۔ ہم اُس کے ضامن ہیں۔ تُو خُدا پر بھروسہ کر کیوں کہ خُدا ہی سبب بناتا ہے۔ خُدا ہی توڑتا اور جوڑتا ہے اور پھر اپنے بچوں کا بھی خیال کر۔ اُن کی پرورش کی خاطر ہی راجاں کے ساتھ پھر سے نکاح کر لے۔ بیٹا تھالی میں نمک نہیں توڑا کرتے۔ تُو اپنا گھر سنبھال۔ لوگوں کا کیا ہے، جتنے مُنہہ اُتنی باتیں۔ تُو اپنی خوشیاں دیکھ۔ اکیلی جان کنڈیالی اور عورت کے ساتھ ہریالی ہے۔ نواب اکیلی تو لکڑی بھی نہیں جلتی۔ اِس لیے ہماری بات مان لے۔ ابھی بھی گرے ہوئے بیروں کا کچھ نہیں بگڑا۔''

''آپ میرے بڑے ہیں، میرے بزرگ ہیں۔ میری بھلائی چاہنے والے ہیں۔ اس لیے مَیں آپ لوگوں کی بات مان لیتا ہوں۔ آپ لوگ چاک دامن سینا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن میری ایک شرط ہے۔۔۔؟

''بول نواب بیٹا بول۔۔۔ کیا چاہتا ہے تُو؟''

''غفور چاچا، مَیں صرف یہ چاہتا ہوں کہ راجاں پہلے عُمرہ کرے یا حج اور اپنے گُناہوں کو بخشوائے۔ اپنے عیبوں کا کفارہ ادا کرے۔ اُس کے تن اور من کی ناپاکی دھوئی جائے۔ پھر مَیں راجاں کو اپنی منکوحہ بنالوں گا۔''

حاجی غفور خان اور رحمت علی نے یہ خوشخبری جمال دین کو سُنائی۔ نواب کی طرف سے عائد کی گئی شرط بھی بتادی۔ جمال دین راجاں کو عُمرہ کرانے کے لیے تیار ہو گیا اور یوں ٹھٹھیروں کے چوبارے کے سُرخے، چینے، لقے اور جونسرے آسمان میں قلابازیاں کھانے لگے۔ کچھ عرصہ بعد جمال دین راجاں کو عُمرہ کرا کے لوٹا تو بڑے بزرگ رازداری کے ساتھ مولوی جی کے پاس گئے اور نواب اور راجاں کا نکاح کروانے کے لیے کہا۔ مولوی جی نے بزرگوں کو شرع کے بارے میں سمجھایا اور کہا کہ نواب کے ساتھ پھر سے نکاح کروانے سے پہلے راجاں کا حلالہ ہونا ضروری ہے یعنی کہ اُس کا نکاح کسی دوسرے مرد کے ساتھ کرانا پڑے گا۔ پھر اُس سے طلاق لے کر نواب خان کے ساتھ نکاح ہو سکے گا۔''

''مولوی جی! کوئی ایسا راستہ نکالیے کہ سیدھا دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے اور اِس حلالے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ نواب کسی دوسرے شخص کے ساتھ راجاں کا نکاح کرانا ہرگز برداشت نہیں کرے گا۔''

''غفور خان صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔؟ یہ بات شرع کے خلاف ہے اور پھر شریعت پر چلنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اِس لیے آپ لوگ نواب کو سمجھاؤ۔ اُسے شریعت کا قانون پڑھاؤ اور اُس پر عمل کرنے کی ہدایت کرو۔ اللہ رحم

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کرنے والا ہے۔ وہ سب کی خطائیں معاف کر دیتا ہے۔''

حاجی غفور خان اور رحمت علی شریعت کی کتابیں لے کر نواب کی حویلی میں آئے اور شریعت کے حوالے سے اُسے مولوی جی کی دلیلیں سمجھائیں اور بتایا کہ اُس کے ساتھ نکاح پڑھانے سے پہلے حلالہ کرنا ضروری ہے۔ نواب نے خود بھی شریعت کا وہ حصہ پڑھا جس میں مولوی جی کی بتائی ہوئی باتوں کا ذِکر تھا۔ وہ حیران و پریشان تھا کہ یہ کون سی سزا ہے کہ حلالے کے بہانے راجاں کو دوسرے مرد کے حوالے کر دیا جائے، چاہے ایک رات کے لیے ہی سہی۔ پہلے یہ کام چُھپ چھُپا کر ہوتا تھا لیکن اب شریعت کی آڑ میں سرِ عام راجاں دوسرے مرد کی بیوی بن کر اُس کے ساتھ رات گُزارے گی۔ پھر اِس بات کا بھی کیا بھروسہ کہ وہ شخص دوسرے روز راجاں کو طلاق دے گا بھی کہ نہیں؟ وہ بڑا فکرمند ہوا۔ وہ پچھتا رہا تھا کہ اگر ایسے ہی حالات پیدا ہونے تھے تو اُس نے راجاں کو طلاق ہی کیوں دی تھی۔ نواب نے غفور چاچا سے سوچنے کا وقت مانگا۔

نواب پوری رات ٹھنڈے دماغ سے سوچتا رہا لیکن یہ حلالے کی چھپکلی بار بار اُس کے گلے میں اٹک جاتی۔ اگر چھپکلی کو تھوکتا ہے تو شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور کُفر کا فتویٰ لگ جاتا ہے اگر نِگلتا ہے تو ضمیر کا پنچھی حلال ہوتا ہے جو پہلے ہی زخمی تھا۔ اُس نے سارے حالات پر غور کیا اور آخر کار حلالے کا کڑوا گھونٹ پینے کے لیے بھی تیار ہو گیا۔

جمال دین اور غفور چاچا ایک ایسے آدمی کی تلاش میں نکل پڑے جو روزی روٹی کے لیے عاجز ہو اور جسے کچھ رقم دے کر اِس شرط پر راجاں سے نکاح کرنے کے لیے تیار کیا جائے کہ نکاح کے دوسرے روز وہ اُسے طلاق دے دے گا۔ بڑی تلاش کے بعد اُنھوں نے خوب ٹھونک بجا کر اور ٹھن ٹھنکا کر ایک ویران مسجد کے نمازی برکت

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کو ڈھونڈ نکالا اور اُس کے ساتھ راجاں کا نکاح کروادیا۔ راجاں، جس کا منہہ گرم دُودھ سے جل چُکا تھا، اب چھاچھ کو بھی پھونکیں مارنے لگی اور دِل ہی دِل میں کہنے لگی کہ ''بھیڑوں نے اُون ہی اُتروانی ہے کوئی اُتار لے۔''

دوسرے دِن سمجھوتے کے مطابق برکت سے طلاق لے لی گئی۔ راجاں کی عِدّت پوری ہونے کے بعد مولوی جی نے نواب کا نِکاح اُس کے ساتھ پھر سے پڑھادیا اور یوں راجاں جس لڑی کا موتی تھی اُسی میں پرودی گئی اور پھر ایک نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے وہ دونوں حج کرنے چلے گئے تاکہ اللہ یاد رہے اور گھر آباد رہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دردِ چھوڑے کا حال

سلوتری گاؤں کی مسجد سے اعلان ہو رہا تھا۔۔۔

''بڑے دُکھ کے ساتھ سب کو اطلاع دی جاتی ہے کہ قاسم منہاس آج رات فوت ہو گیا۔ وہ اپنے گھر میں سویا ہوا تھا کہ سرحد پار سے ہونے والی فائرنگ میں ایک گولہ اُس کے مکان کے اندر گرا۔ گولہ پھٹنے سے قاسم منہاس موقع پر ہی دم توڑ گیا۔ خُدا کا شُکر ہے کہ اُس کی بیوی اور بچے بچ گئے کیوں کہ وہ پڑوس میں سوم ناتھ کے گھر شادی کے گیت گانے گئے تھے۔ نمازِ جنازہ دِن ڈھلے چار بجے پڑھی جائے گی۔''

سلوتری پونچھ، راولپنڈی سڑک پر ہمارا آخری گاؤں ہے۔ آج کل یہ سڑک فوجی چوکی پر ختم ہو جاتی ہے۔ گاؤں کے بالکل سامنے اور سرحد کی دوسری جانب تیتری نوٹ کا گاؤں ہے اور بیچ میں پونچھ دریا۔ اِس دریا کو آپ یہاں ''نو مین لینڈ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ سرحد کے دونوں طرف فوجیوں کا گولہ باری کرنا روز کا معمول ہے۔ فائرنگ اور جوابی فائرنگ اپنی فوجی قوّت کا احساس دِلانے، جوانوں کو چاک و چوبند رکھنے اور دشمن کو سبق سِکھانے کے لیے بہت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اِس فوجی طاقت کے مظاہرے میں نہتی زمین جھلس جاتی ہے پھر جھلسی ہوئی زمین سے موت اُگتی ہے۔ وحشت پھیلتی ہے۔ معصوم لوگوں کی جانیں تلف ہوتی ہیں۔ پر اتنی قیمت تو چُکانی پڑتی ہے۔۔۔ سرحدوں کی حفاظت اور ملکوں کی سلامتی کے لیے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

۔۔۔مسجد سے اعلان ہوتے ہی لوگ جوق در جوق قاسم منہاس کے گھر پہنچنے لگے۔ بچے مرد عورتیں یار، دوست، رشتے دار کس بلاڑی، جُھلاس، منگناڑ، درّہ اور دوسرے دیہاتوں سے لوگ جنازے میں شامل ہونے، میّت کو کندھا دینے، قبر پر مٹی ڈالنے اور سوگوار خاندان کا غم بانٹنے کے لیے آنے لگے۔ ایسے حادثے یہاں آئے دِن ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں لوگ ایسے دِلدوز صدمے برداشت کرنے کے عادی ہیں۔ ابھی چند روز قبل گوبند رام کے گھر پر مارٹر کا گولہ گرا تھا۔ جس میں اُس کی ماتا کا دیہانت ہوا تھا۔ دو بھینسیں اور ایک گائے بھی لُقمۂ اجل بن گئی تھی۔ کھیت میں کام کر رہے سُنیل کو بھی تو دریا پار سے آنے والی گولی نِگل گئی تھی۔ اپنوں کا ماتم کرنا اور آنسو بہانا یہاں کا چلن ہے۔ خوبصورت زندگی پر بدصورتی کے منحوس رنگ چڑھنے سے لوگ یہاں مشتعل نہیں ہوتے۔ اِنسانی جانیں ضائع ہونے پر یہ لوگ جذباتی نہیں ہوتے۔ آپسی بھائی چارے کو یہ توڑتے نہیں۔ کسی کو الزام نہیں دیتے کیوں کہ ایسا ہی ہر روز دریا کے پار بھی تو ہوتا ہے۔ اِدھر سے گولے وہاں بھی داغے جاتے ہیں۔ مکان وہاں بھی مسمار ہوتے ہیں۔ معصوم لوگ وہاں بھی مرتے ہیں۔ ماتم وہاں بھی کیا جاتا ہے۔ ماتمی چیخیں دونوں طرف سُنی جاتی ہیں۔ آنسوؤں کے سیلاب میں جذبات اور احساسات دونوں طرف ڈوبتے اُبھرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ زرد پتوں کی طرح ہیں جو سرحد کی دونوں طرف بکھرے پڑے ہیں۔۔۔ اپنے اپنے جسموں کا بوجھ اُٹھائے۔ اِن کے دھڑکتے دِلوں کی داستانیں کوئی رقم نہیں کرتا۔ اِن کی ذِلتوں اور اذیتوں کی کہانی کوئی نہیں سُناتا۔

قبر کھودنے، کفن سینے اور غُسل دینے کا انتظام ہونے لگا ہے۔ دوست، احباب قاسم منہاس کی اچھائیوں کا ذِکر کر رہے ہیں۔ محبت، شرافت اور دیانت کی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

باتیں ہو رہی ہیں۔ سلوتری میں تعینات بٹالین کمانڈر کرنل جارج، میجر فاروقی اور میجر چکرورتی بھی پہنچ چکے ہیں۔ جنازے میں شرکت کرنے اور غمزدہ کنبے کے ساتھ اظہارِ ہمدردی جتلانے کے لیے۔ خاتونِ خانہ رو رو کر بین کر رہی ہیں۔ اُن لوگوں کو بھی یاد کیا جا رہا ہے جو اِس بارود کی زد میں آ کر اپنوں کو داغِ ہجر دے چکے تھے لیکن رونے کی آوازیں کہیں دور سے بھی تو آ رہی تھیں۔

''اتنی دُور سے یہ رونے کی آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں؟'' میجر چکرورتی ماتم پُرسی کے لیے آئے ایک دیہاتی سے پوچھ رہا تھا۔

''سر! یہ آوازیں دریا کے پار والے گاؤں تیتری نوٹ سے آ رہی ہیں۔'' امر ناتھ بولا۔

''شاید وہاں بھی کسی کی موت واقع ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی معصوم اِدھر سے چلائی گئی گولی کا نشانہ بنا ہو۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو بھائی امر ناتھ! بندوق اور توپوں سے نکلنے والا بارود بھلا کسی کو بخشتا تھوڑی ہے۔'' موضع جھلاس کے بزرگ سرپنچ لیش پال نے کہا۔

''پنڈت جی! آپ سچ کہتے ہیں۔ مُلک چاہے الگ الگ ہوں یا زبانیں الگ الگ ہوں لیکن ہنسنے، رونے اور بین کرنے کی آوازیں ایک سی ہوتی ہیں۔ یہ اِنسان کا فطری عمل ہے۔ یہ آوازیں یہودی یا عیسائی نہیں ہوتیں اور نہ یہ آوازیں ہندو اور مُسلمان ہوتی ہیں۔'' چودھری فیروز کہہ رہا تھا۔

''سیاست کا ایک دمن چکر چل رہا ہے۔ کبھی آگ بھڑکائی جاتی ہے اور کبھی بُجھائی جاتی ہے۔ گولہ بارود کا یہ کھیل دونوں طرف سے کھیلا جا رہا ہے۔ انہیں کون سمجھائے کہ بارود کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ ٹینک اور توپیں کسی عقیدے سے وابستہ نہیں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہوتیں۔ یہ ہمارے پاس ہوں یا اُن کے پاس اِن کا کام تباہی اور بربادی پھیلانا ہے۔ اِن کا دھرم دھرتی کو بانجھ بنانا ہے۔ ہلاکتیں کرنا ہے۔ گولی اپنی ہو یا پرائی۔۔۔ یہ زندگی کا شکار کرتی ہے۔ آنسو رُلاتی ہے۔ سُہاگ اُجاڑتی ہے۔ یتیم بناتی ہے۔ ماؤں کی گود سونی کرتی ہے۔ دھرتی نے یہاں جہنّم کا لباس اوڑھ رکھا ہے۔ اُس دھرتی نے جسے کبھی ''فردوس برروئے زمین'' کہا جاتا تھا۔

کفن سیا جا چُکا ہے۔ میّت کو غُسل دیا جا رہا ہے۔ گورکن نے قبر کھود ڈالی ہے۔ جنازہ اُٹھنے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ بچے حیرت زدہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔۔۔ بچے۔۔۔ کہ جن کا بچپن اور معصومیت خوف اور دہشت نے چھین لی ہے۔ یہ کبھی کھلونوں سے نہیں کھیلے۔ اِنھوں نے تو کھلونے دیکھے ہی نہیں ہیں۔ ہاں! بندوقیں اور پستولیں دیکھی ہیں۔ ہتھ گولے دیکھے ہیں۔ جن کو کھیتوں میں پڑے دیکھتے ہی یہ بچے گیند سمجھ کر اُٹھا لیتے ہیں اور اُن سے کھیلنے لگتے ہیں۔۔۔ اور جن کے پھٹنے سے اُن کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں۔ اور کئی تو عمر بھر کے لیے معذور ہو جاتے ہیں۔

یہ لوگ خدشات کی دُھند میں گھرے رہتے ہیں۔ ڈر اور وحشت میں جیتے ہیں۔ اِن کی صداقتیں اور حقیقتیں مصلحتوں اور سیاستوں کی صلیب پر قُربان ہوتی رہتی ہیں۔

چار بج رہے ہیں۔ جنازہ اُٹھنے کو تیار ہے۔ لوگ کلمہ شہادت پڑھ رہے ہیں۔ دوست اور رشتے دار قاسم منہاس کے تابوت کو کندھا دینے کے لیے تیار ہیں۔ جنازہ کا جلوس چلنے لگا ہے۔ قاسم منہاس کو اُس کی آخری آرام گاہ تک لے جانے کے لیے۔ قبر میں دفنانے کے لیے۔ دریا پار سے بھی رونے کی آوازیں اب صاف سُنائی دے رہی ہیں۔ عورتیں وہاں بھی بین کر رہی ہیں۔ رونے کی اُنہی آوازوں میں ایک آواز وہاں کی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اُبھر رہی ہے۔۔۔

''گاؤں والو! نہایت افسوس اور دُکھ کے ساتھ یہ خبر دی جا رہی ہے کہ میرا چھوٹا بھائی قاسم منہاس ہمارے آبائی گاؤں سلوتری میں وفات پا گیا ہے۔ اُس کی غائبانہ نماز جنازہ شام چھ بجے جامع مسجد تیتری نوٹ میں پڑھی جائے گی۔ مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لیے سب کو غائبانہ نمازِ جنازہ میں شرکت کی استدعا کی جاتی ہے۔ اللہ ہم سب کو اپنے حفظِ امان میں رکھے اور امن سے جینے کی توفیق عطا کرے آمین۔

جنازے کا جلوس قبرستان پہنچ چکا تھا۔ قاسم منہاس کی لاش قبر میں اُتاری جا چکی تھی۔ امام صاحب مرحوم کی مغفرت کے لیے دُعائیں مانگ رہے ہیں اور لواحقین کے لیے صبرِ جمیل۔۔۔ دعائیں ہوا، پانی اور مٹی میں تحلیل ہو رہی ہیں کہ جن کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سانجھا درد

''اپنا کشمیر'' جماعت کی طرف سے ایک جلسہ اِندرا بھون میں منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں کشمیر سے ہجرت کر کے آئے اقلیتی فرقہ کے ہزاروں کشمیری شرکت کر رہے تھے۔ دہشت گردی کے خلاف اور کشمیر کو بھارت سے الگ کرنے والی طاقتوں کی سازشوں کو ہر قیمت پر ناکام بنانے کے لیے دھُواں دار تقریریں ہو رہی تھیں۔ ''وندے ماترم'' اور ''بھارت ماتا کی جے'' کے فلک شگاف نعرے لگ رہے تھے۔ اُگر وادیوں کو جہنم رسید کرنے کا عزم دُہرایا جا رہا تھا۔ آئی ایس آئی اور اُن کے مقامی ایجنٹوں کی طرف سے رچی گئی سازش کے تحت اقلیتی فرقہ کے لوگوں کو وادیِ کشمیر سے نِکلنے پر مجبور کرنے پر اُن کی مذمّت کی جا رہی تھی۔ پنڈت گاش لعل کول کی تقریر سب سے زیادہ جوشیلی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا:

''ہم کشپ رشی کی اولاد ہیں۔ ہم کشمیر کے اصل وارث ہیں۔ کشمیر ہمارا ہے۔ کلہن کی راج ترنگنی پڑھ کر دیکھ لیں کہ رِشیوں مُنیوں کی اِس دھرتی پر ہزاروں سال سے ہمارا راج رہا ہے۔ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور جو لوگ اِس بات کو ماننے سے اِنکار کرتے ہیں وہ کشمیر کو چھوڑ دیں اور اُس مُلک میں چلے جائیں جہاں سے اُن کو آتنک واد پھیلانے کے لیے پیسہ اور ہتھیار ملتے ہیں۔''

گاش لعل کول کشمیر کے بارے میں سرکار کی کمزور پالیسیوں کی بھی سخت نُقطہ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

چینی کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:

''کشمیر کے بارے سرکار کی کوئی واضح پالیسی نہیں ہے۔ یہاں ''مکر چکر کی کہانی، آدھا تیل، آدھا پانی'' والی بات ہے۔ سرکار کبھی الگاؤ وادیوں اور دہشت گردوں سے بات چیت کرنے کا اعلان کرتی ہے تو کبھی اُگروادکو جڑ سے ختم کرنے کے لیے فوجی کاروائی جاری رکھنے کی بات کرتی ہے۔ کبھی فائر بندی کرتی ہے تو کبھی فائر بندی ختم کرنے کا اعلان۔ ایسا پچھلے کئی سالوں سے ہو رہا ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں دھُول جھونکی جا رہی ہے مگر نہ ہیر ختم ہوئی ہے اور نہ سرنگی ٹوٹی ہے۔ سرکار کبھی کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ کہتی ہے اور لوک سبھا سے اِس امر کی قرارداد پاس کراتی ہے، تو کبھی اِس کو ایک حل طلب مسئلہ کہتی ہے۔ کبھی ہمسایہ مُلک کے حُکمرانوں کو کوستی ہے تو کبھی اُن کو کشمیر مسئلہ پر گُفت وشنید کی دعوت دیتی ہے۔ تاشقند، شملہ، آگرہ، دہلی، اسلام آباد اور لاہور۔۔۔ صرف باتیں ہی باتیں۔ اِن باتوں نے لوگوں کی مُسکراہٹیں چھین لی ہیں لیکن سب لاحاصل۔ سرکار کشمیر میں اُن لوگوں کے ناز اُٹھاتی ہے جو دیش کے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں، اُن لوگوں کے پاؤں چاٹتی ہے جنہوں نے ہمارا قتل کیا، ہمیں کشمیر سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا اور ہمیں اپنے ہی دیش میں مہاجر بنا دیا۔ ہم لوگ جنہوں نے کشمیر میں بھارت کا ترنگا بُلند رکھا، کڑکتی دھوپ، وحشی برسات اور یخ بستہ سردی میں کُھلے آسمان کے نیچے رہنے پر مجبور ہیں۔ ہمیں تو جیون گُزارنے کے لیے بُنیادی سہولتیں بھی دستیاب نہیں ہیں''۔

اُس نے کشمیر میں علیحدگی کی تحریک چلانے والوں اور دہشت پھیلانے والوں کو جی بھر کے گالیاں دیں اور مطالبہ کیا کہ اُنھیں کشمیر میں الگ سے ہوم لینڈ دیا جائے۔ پنڈت گاش لعل کول کا بھاشن سُن کر لوگوں میں ایک جوش ایک ولولہ جاگا تھا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

وہ اُس کو اپنا سچا نمائندہ ماننے لگے۔ تالیوں کی گونج میں گاش لعل کول نے اپنی تقریر ختم کی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد ڈھیر ساری تعریفوں کے الفاظ دِل کی بگنی میں ڈال کر وہ اپنے رہائشی کیمپ کی طرف چل پڑا۔ رگھوناتھ بازار میں اُس نے ایک عُمر رسیدہ شخص کو دیکھا جو پھرن پہنے، سر پر پگڑی اور کاندھے پر پشمینے کا شال آویزاں کیے چل رہا تھا۔ گاش لعل کول لاشعوری طور پر اُس شخص کی طرف لپکا اور بے ساختہ اُس سے بغل گیر ہو گیا اور کہنے لگا:

''بندگی جناب، بندگی، خواجہ صاحب! کیا حال ہے آپ کا؟ آپ ٹھیک ہیں۔ آپ کے بچے راضی خوشی ہیں؟''

''نمسکار حضور! خُدا کا شُکر ہے کہ ابھی تک زندہ ہیں اور راضی خوشی ہیں۔ آپ بتائیں پنڈت جی! یہاں سب کُشل منگل ہے؟ آپ کی صحت ٹھیک ہے۔ آپ کے بچے بھی راضی خوشی ہیں؟''

''ہاں خواجہ صاحب! بھگوتی کی کرپا سے اور دستگیر صاحب کی دُعا سے ہم یہاں کُشل ہیں۔ آپ بتائیں، وہاں کشمیر میں اب حالات قدرے سُدھرے ہیں یا مار کاٹ کا بازار ابھی بھی گرم ہے؟ اب تو وہاں کوئی مُخبری نہیں کرتا ہوگا؟ اب تو وہاں کوئی غدّار نہیں ہوگا؟ کیا آپ لوگ ہمیں یاد کرتے ہیں؟'' گاش لعل کول خواجہ صاحب سے پوچھ رہا تھا۔

''ہم آپ کو ایک پل کے لیے بھی نہیں بھولے پنڈت جی۔ بھلا ہم آپ کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ ہم تو صدیوں سے اکٹھے رہے ہیں۔ بھائیوں کی طرح۔ اپنوں کی طرح، پیار اور محبت کے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ امن و امان سے زندگی گزاری ہے۔ ہمارا خون ایک ہے۔ ہماری نسل ایک ہے۔ ہماری زبان ایک ہے۔ ہمارا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

تمدّن ایک ہے۔ تہذیب ایک ہے۔ ہمارے سنت فقیر اور رِشی سانجھے ہیں۔ ہمارے گیت سانجھے ہیں۔ ہمارے دُکھ اور خوشیاں سانجھی ہیں۔ ہم آپ کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ ہم تو آپ کے بغیر ادھورے ہیں۔ باقی پنڈت جی! وہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں کون مُخبر ہے اور کون مجاہد، کون غدّار ہے اور کون قوم پرست، کون فسادی ہے اور کون جہادی، کون عوامی ہے اور کون سرکاری، کچھ پتہ نہیں چلتا۔ وہاں ہر کوئی اپنے پھل کو میٹھا کہتا ہے۔ کھوٹی تو ہماری تقدیر ہے۔ بڑی طاقتیں بیان بازیاں کر کے ہمارے زخموں پر نمک چھڑکتی رہتی ہیں۔ یوں سمجھیں کہ رَنڈی کے گھر منڈی لگی ہوئی ہے۔ اِنسانیت مرگئی ہے۔ حالات ویسے ہی ہیں، جیسے بائیس سال پہلے تھے۔ آگ اور خون کا ننگا ناچ جاری ہے۔ بربریت کا راج ہے۔ لوگ سخت تنگ ہیں۔ دونوں اطراف کی بندوقوں کا شکار ہیں۔ سارا کشمیر جل رہا ہے۔ ہر طرف تباہی ہی تباہی ہے۔ پنڈت جی! خُدا ہماری قسمت کے بوسیدہ کپڑے کسی کو نہ پہنائے۔ ہماری اُجڑی وادی میں رنگ برنگے لنگور، پٹواری بنے ہوئے ہیں۔'' بوڑھا شخص بڑی مایوسی میں بول رہا تھا۔

''بھگوان آپ پر رحم کرے۔ نُند رِشی کشمیر میں امن لائے اور ہم سب دوبارہ اکٹھے مِل کر رہ سکیں''۔ گاش لعل کول نے کہا۔

''ہاں! ہم بھی ہر روز یہی دُعا مانگتے ہیں، لیکن پنڈت جی! آپ بُرا نہ منائیں، مَیں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ شاید بڑھاپے کی وجہ سے میری یاداشت ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ آپ کا نام کیا ہے اور آپ کشمیر میں کہاں کے رہنے والے ہیں؟'' اُس شخص نے بڑے خلوص سے پنڈت گاش لعل کول سے پوچھا۔

''خواجہ صاحب! مَیں نے بھی بھلا آپ کو کہاں پہچانا ہے۔ مَیں تو آپ کو

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بالکل نہیں جانتا۔ آپ کو کشمیری لباس میں دیکھ کر مَیں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا اور بے اختیار آپ کو گلے لگا لیا۔ آپ کو گلے لگا کر مجھے ایک سکون سا ملا۔ آپ سے گلے مل کر مجھے لگا کہ مَیں کشمیر کو گلے لگا رہا ہوں اور پنڈت گاش لعل کول نے خواجہ صاحب کو ایک بار پھر اپنی بانہوں میں لے لیا۔۔۔ اور فرطِ جذبات میں دونوں کی آنکھوں سے جہلم اُمڈ پڑا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

عرج وزوال کا المیہ

سورج دھرتی کو اُجالا بخشتا ہے اور دھُوپ کی رُتیں جگ میں بانٹتا ہے، مگر سورج آخر کو ڈوب جاتا ہے اور اندھیرا دھُوپ کی تمازت کو کھا جاتا ہے۔ دِن رات کی یہی حقیقت ہے۔ یہی برُبھو کی بانی ہے اور یہی دھُوپ چھاؤں کی کہانی ہے۔

دھُوپ چھاؤں کی یہ کہانی جگتو جٹ کے ماتھے پر بزُرگوں نے بہت پہلے پڑھ لی تھی لیکن پرائے بیلنے میں بازو دینے سے ڈرتے ہوئے اُنہوں نے چُپ سادھ لی تھی۔ جگتو جٹ کے بڑے بزُرگ دیکھتے رہتے تھے کہ اُس نے جیون میں کبھی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کیا تھا بلکہ ہمیشہ مکر چکّر اور فریب کاری سے اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کا جتن کیا کرتا۔ اُس کی دوستی لچّوں، لفنگوں اور غُنڈوں کے ساتھ تھی جن کی سنگت میں رہ کر وہ فوراً امیر بننے کے منصوبے بناتا رہتا۔ اپنی ہوشیاری اور مکّاری کی وجہ سے وہ اپنے دوستوں کے گروہ کا سرغنہ بن گیا۔ وہ جلدی سے جلدی اپنی غُربت کا طوق اپنے گلے سے اُتارنا چاہتا تھا اور امیری کا پٹہ گلے میں ڈالنا چاہتا تھا، مگر اُسے کون سمجھاتا کہ آج کے لگائے اُپلے آج نہیں جلتے اور جلنے کے لیے اُن کا سوکھنا ضروری ہے، جس کے لیے صبر کرنا پڑتا ہے۔ پر وہ تو اپنی خواہشوں کا جھُولا اُونچے سے اُونچے درخت پر ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کی دستار کا طُرہ اُونچا ہو جائے تاکہ غریبوں اور مسکینوں کو نمسکار کی چٹی پڑتی رہے۔ اُس کا ماننا تھا کہ جس کے پاس زر ہو وہ نر ہوتا ہے، ورنہ خر۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جگتو جٹ نے خچروں پر ریت، مٹی، اینٹ، اور بجری ڈھونے کا کام کیا۔ ڈرائیوری کی، ٹرک چلایا، ٹریکٹر چلایا، دیسی شراب کی بھٹیاں لگائیں۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر سرحد کے آر پار تسکری کی۔ چرس اور ہیروئین بیچی۔ چوری کا سیمنٹ اور لوہا فروخت کیا۔ کوڑیوں کے بھاؤ زمینیں خریدیں اور سونے کے بھاؤ بیچیں اور یوں دس پندرہ سالوں کے اندر اندر جگتو جٹ چودھری جگت سنگھ بن گیا۔ اور یہ کہاوت سچی ہو گئی کہ رب کی بے پروائی، کُتے کھائیں ملائی۔

کچے کوٹھوں کی جگہ پکّی کوٹھیاں اور حویلیاں بن گئیں۔ خچروں کے بدلے قیمتی کاریں آ گئیں اور کھُرلیوں کی جگہ پکّے گیراج بن گئے۔ زندگی نے ایسی پلٹی ماری کہ دولت کی ریل پیل ہوگئی۔ چھپر پھاڑ کر بھی اتنا مال خزانہ نہیں ملتا، جتنا چودھری جگت سنگھ کے پاس آ گیا تھا۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ''اللہ مہربان تو گدھا پہلوان'' چودھری جگت سنگھ بڑے بڑے ٹھیکے لینے لگا۔ ٹرانسپورٹ کمپنی بنالی۔ ٹھیکے لینے اور دوسرے کام کروانے کے لیے سرکاری اہلکاروں کو نذر، نذرانے دیے جانے لگے۔ بھائی بھتیجے اور سالے بہنوئی سب کاروبار میں دو آنے یا چار آنے کے حصے دار بنائے گئے۔ اِنکم ٹیکس اور سیل ٹیکس بھرنے کے لیے اکاونٹنٹ رکھے گئے۔ دفتر بن گئے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ملازم رکھے گئے۔ بنک کھاتے کھولے گئے۔ سود پر رقم دی جانے لگی۔ لُچے یار دادا گری کرتے۔ غُنڈہ گردی اور مار کٹائی کرتے۔ ڈر اور دہشت پھیلا کر پیسے وصول کرتے۔

اِس طرح جگتو جٹ اپنی دُنیا کا بادشاہ بن گیا۔

ترقی کا یہ راستہ طے کرنے کے لیے چودھری جگت سنگھ نے کتنے لوگوں کا حق مارا تھا اُس کو خود بھی یاد نہیں تھا۔ اُس کے موالیوں نے کتنے لوگوں پر گولیاں چلائی تھیں اور کتنوں کو زخمی کیا تھا، اُس کا بھی کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ ہر واردات کو پولیس دبا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دیتی کیونکہ روز ناچے سِکّوں کی سیاہی سے لکھے جاتے۔ سنتری، منتری اور جنتا جنتری سبھی چودھری کے روغنی گھڑے کا شربت پیتے رہتے تھے۔

پھر اُس کی بیوی نے ایک بچے کو جنم دیا اور سارے گاؤں میں جشن کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مبا کبادیاں اور مٹھایاں بانٹی گئیں۔ ڈھول دھماکے، ناچ اور نغمے کئی دِنوں تک چلتے رہے۔ بیٹے کو بڑے لاڈ پیار سے پالا۔ اتنے لاڈ پیار سے کہ اُس کا نام ہی لاڈی سنگھ رکھ دیا گیا۔ لاڈی چودھری کی آنکھوں کا نور اور دِل کا سرور تھا۔ اُس کے پالن پوسن میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی۔ اُسے بڑھیا سے بڑھیا سکولوں اور کالجوں میں پڑھنے کے لیے بھیجا گیا۔۔۔ پر سب بے کار۔

لاڈی نے جب پر پُرزے نکالنے شروع کیے تو وہ چودھری جگت سنگھ کی جُوتی میں اپنے پاؤں ڈالنے لگا اور باپ کی رنگت کے ساتھ سنگت کرنے لگا۔ بات چیت میں اُسے اپنے باپ کا انداز اِتنا بھایا کہ اُس کی زبان بھی تیکھی اور تُرش ہو گئی، جس کی وجہ سے پانی میں بھی آگ لگ جاتی۔ اور یہ ثابت ہو جاتا کہ جیسا باپ، ویسا بیٹا۔ کالج میں اُس کا ایسے دوستوں سے پالا پڑا جو اُس سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ اُن کی صحبت میں لاڈی کو شراب، کباب اور شباب کے ساتھ ساتھ چرس اور گانجے کا بھی چسکا لگ گیا۔ پھر وہ گاؤں چھوڑ کر شہر والی کوٹھی میں رہنے کی ضد کرنے لگا۔ وہ باپ سے کہتا "بسنا شہر، چاہے ہو قہر"۔ لاڈی کے لاڈ پیار نے چودھری کو اُس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا اور یوں لاڈی شہر والی کوٹھی میں موج مستیاں کرنے لگا۔ یار دوستوں کی محفلیں سجنے لگیں۔ شباب اور رباب سے دِل بہلنے لگے۔ چاچی اور تائی نے لاڈی کی خرمستیوں کی جانب جب اُس کی ماں کا دھیان دلایا تو اُس نے ناک منہہ چڑھاتے ہوئے جواب دیا:

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''اِس عُمر میں لڑکے ایسی کھیلیں کھیلتے رہتے ہیں۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آنے والی دُلہن لاڈی کو اپنے پیار کی زنجیروں میں ایسی جکڑے گی کہ وہ آوارہ گردی کا نام بھی نہ لے گا اور پھر حاسدوں کے منہہ بند ہو جائیں گے''۔

پھر وہ وقت بھی آ گیا جب باپ بیٹا اکٹھے کھانے پینے لگے۔ دو تین پیگ پینے کے بعد چودھری لاڈی کو سماج میں عزّت کمانے کے گُر بتلانے لگتا اور اُسے سمجھاتا کہ وہ غُنڈہ گردی اور آوارگی چھوڑ کر سارا دھیان اپنی پڑھائی مکمل کرنے کی طرف لگائے تا کہ وہ کاروبار سنبھالے اور باپ کا ہاتھ بٹائے۔ وہ اُسے کہتا کہ زبان رسیلی ہو تو دُنیا رنگیلی ہو جاتی ہے۔ لاڈی باپ کی نصیحت کو ایک کان سے سُنتا اور دوسرے کان سے باہر نکال دیتا کیوں کہ اُس نے کبھی باپ کو رسیلی زبان میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ اُس کے منہہ سے گالیوں کے بم پھٹتے دیکھا کرتا تھا۔ پھر وہ دِن بھی آ گئے جب لاڈی کے پیر چودھری جگت سنگھ کی جُوتی کو پھاڑ کر باہر نکلنے لگے۔ اُس نے اپنی ایک الگ منڈلی بنالی۔ جس کا کام تھا ہم عمر لڑکے لڑکیوں کو تنگ کرنا، گالیاں بکنا، دھمکیاں دینا، دھونس جمانا، اور روکنے ٹوکنے والوں کے ہاتھ پاؤں توڑنا۔ چوہدری کے رسوخ اور چوگا ڈالتے رہنے کی حکمتِ عملی کی وجہ سے لاڈی ہمیشہ پولیس کاروائی سے بچ جاتا اُسے شہ ملتی گئی اور وہ جُرم پر جُرم کرنے لگا۔ ایک قتل کیس میں بھی پھنسا لیکن چودھری کے دُلار نے اُس پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ لاڈی ایک ایسا کریلا تھا جو ہمیشہ نیم پر چڑھا رہتا۔ اُس کی روز روز کی حماقتوں سے چودھری اور اُس کے بھائی بہت دُکھی تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ''کالے پٹ نہ چڑھے سفیدی اور کاگ کبھی نہ بنے بگلہ'' سب نے مل کر یہ فیصلہ کر لیا کہ اُس کی شادی کر دی جائے۔ شادی ہوئی اور دھوم دھام سے ہوئی۔ سارا شہر اور گاؤں شادی میں شامل ہوا۔ دُلہا دُلہن کو ہنی مون کے لیے سوئیزرلینڈ بھیجا گیا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

وہاں پہلے دِن سے ہی لاڈی نے اپنا رنگ بتانا شروع کر دیا۔ واپسی پر جب چوہدری اور چوہدرائین نے دُلہن کے چہرے اور جسم پر زخموں کے نشان دیکھے تو وہ ششدر رہ گئے۔ اُن کے پوچھنے پر دُلہن زاروقطار رونے لگی۔ چوہدری اُسے دلاسہ دینے لگا اور سمجھانے لگا:

''بیٹی! کسی سے بات نہیں کرنا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم صبر کرو۔ صبر کرنے سے اجر ملتا ہے لیکن وہ جان گئی تھی کہ لاڈی کے ساتھ رہ کر اُس کے ہاتھ سدا مہندی رنگے نہیں رہیں گے اور نہ ہی سدا اُس کی بانہوں میں چوڑیاں کھنکیں گی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اُس کو اپنا چرخہ خود سنبھالنا پڑے گا اور اپنا سُوت بھی خود ہی کاتنا پڑے گا کیوں کہ شادی کے باوجود بھی لاڈی کے رنگ ڈھنگ میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ چوہدری کو دُکھ کی کنکریاں مارتا رہتا۔ چوہدری کا دِل درد سے کراہتا رہتا اور وہ خود سے بولنے لگتا۔

''ایک انڈا، وہ بھی گندہ''۔

لاڈی چوہدری کے ظروف میں ایسا تو اتھا جو آگ کے تاؤ میں ہمیشہ تپتا رہتا اور باپ کے کلیجے کو جلاتا رہتا۔ اُس کی کرتوتیں دیکھ کر چوہدری کئی بار اُسے بدُعائیں دیتا اور کہتا ''بیٹا کپُوت، مرے مردود''۔

پھر قسمت کا لِکھا کوئی نہ ٹال سکا۔ لاڈی شراب کے نشے میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک اور دوست کے گھر گیا۔ وہاں کسی بات پر دونوں میں تکرار ہوئی۔ پھر بات تلخ کلامی اور گالی گلوچ تک پہنچ گئی۔ دوستوں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی لیکن لاڈی کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اُس نے دیسی پستول سے گولی چلا دی اور اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ لاڈی تو جائے واردات سے بھاگ گیا لیکن اُس کے دونوں دوست پکڑے گئے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جس کا بیٹا مرا تھا، وہ راج نیتی کا ایک منجھا ہوا کھلاڑی تھا اور سرکار، دربار میں اُس کی بڑی عزت تھی۔ اُس کی پہنچ سیدھی وزیرِ اعلیٰ اور پردھان منتری تک تھی۔ اُس نے پولیس اور سرکار کی چارپائی کی چُولیں ہلا کر رکھ دیں۔ ایک تھرتھراہٹ مچ گئی۔ سب نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور کوئی بھی چوہدری کی مدد کرنے کو تیار نہ ہوا۔ پولیس نے لاڈی کو ہتھیار سمیت پکڑ لیا اور حوالات میں بند کر دیا۔ سرکار نے واقع کی تحقیقات کے لیے ایک خصوصی ٹیم تشکیل دی جس نے اپنا کام تھانے کے روزنامچے سے شروع کیا جس میں چوہدری کا شہد اور شکر ملا ہوا تھا اور جس میں لاڈی کو بچانے کے لیے سارا مواد موجود تھا۔ فورنسک لیبارٹری کے ماہرین کی رپورٹ بھی کیس کی مِثل کے ساتھ شامل کر دی گئی۔ جس کے مطابق گولی ضبط کی گئی پستول سے نہیں چلی تھی۔۔۔ اور یہ بات سچ بھی تھی کیوں کہ پولیس تھانے میں سب کی ملی بھگت سے آلۂ قتل تبدیل کر دیا گیا تھا جس کے لیے لاکھوں کا پرشاد بانٹا گیا تھا۔ لاڈی چاہے ''لاڈلا پُوت، کنالی میں مُوت'' ہی سہی، پر تھا تو چوہدری کا لختِ جگر۔ اِس حادثے نے اُس کے کلیجے پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اِس لیے وہ اپنے لاڈلے کو بچانے کے لیے تمام حربے استعمال کرنے لگا۔ لیکن ہر چال اُلٹی پڑ رہی تھی۔ ابتدائی تحقیقات سے تفتیشی ٹیم اِس نتیجہ پر پہنچی کہ وہ پستول غائب کر دی گئی ہے جس سے گولی چلی تھی اور اِس سازش میں پولیس اہلکاروں کے ساتھ ساتھ فورنسِک لیبارٹری کے ماہرین بھی شامل تھے۔ ایسا اِس لیے کیا گیا تھا تا کہ قتل کا کیس کسی دوسرے شخص پر ڈالا جائے اور لاڈی کو بچایا جائے۔

خصوصی تفتیشی ٹیم کے سربراہ کی سفارش پر ضلع پولیس افسر، تھانیدار، مُنشی تھانہ اور فورنسِک لیبارٹری کے دونوں ماہرین گرفتار کر لیے گئے۔ چوہدری اور اُس کے بھائیوں نے خوب دوڑ دھوپ کی مگر کُچھ نہ بنا۔ جُرم کو مٹانے اور مُجرم کو بچانے کی سازش

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

میں چوہدری اور اُس کے بھائی حوالات میں بند کر دیے گئے۔ لاڈی اور اُس کے دوستوں پر قتل کا مقدمہ درج کیا گیا۔ باقی سب پر پُورا رنبیر پینل کوڈ اُنڈیل دیا گیا۔

سبھی مُلزم پہلے پولیس ریمانڈ پر حوالات میں بند ہوئے اور تفتیش چلتی رہی۔ پھر ساٹھ دِنوں کے اندر اندر تمام مُلزموں کے خلاف عدالت میں چالان پیش کر دیا گیا اور وہ عدالتی تحویل میں جیل بھیج دیے گئے۔ ضمانتوں کے لیے جج صاحبان کو درخواستیں دی گئیں۔ ہائیکورٹ اور سُپریم کورٹ تک اپیلیں کی گئیں۔ مُلک کے نامی وُکلا نے ضمانتوں کے لیے بحث میں حصہ لیا لیکن کسی کو بھی ضمانت نہ ملی۔ اخباروں اور ٹیلی ویژن چینلوں نے اِس واقعہ کو اِتنا اُچھالا کہ ہر طرف سے عوامی ردِعمل چوہدری بھائیوں کے خلاف تھا۔ چوہدری کے ہاتھوں عتاب اور عذاب برداشت کرنے والے کئی لوگوں نے بھی اُن کے خلاف عدالت میں درخواستیں دائر کرنی شروع کر دی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ سارا شہر ہی چوہدری جگت سنگھ اور اُس کے بھائیوں کے کالے کارناموں کو اُچھال رہا ہے۔ جبھی تو کسی کو بھی جیل کی سلاخوں سے نجات حاصل نہ ہو سکی۔ اِس میڈیا ٹرائل کی وجہ سے بھی سبھی مایوس تھے، بے چین تھے، پریشان تھے اور ایک دوسرے کو کوستے رہتے اور آپس میں اُلجھتے رہتے۔

لاڈی۔۔۔ چوہدری جگت سنگھ کے سر کی جُوں تھا۔ جس نے اُس کا سارا سر ہی گنجا کر دیا بلکہ باقی لوگوں کے سینے بھی چھلنی کر دیے۔ چوہدری نے اپنی آبرو کا صدقہ مال و دولت سے ادا کیا لیکن آبرُو پھر بھی مٹی میں مل گئی۔ لاڈی کے کارن چوہدری کا گھر بار اُجڑا اور خوار سب ہوئے۔ مولا سائیں نے آنکھیں کیا پھیریں کہ کُل جہان ویری ہو گیا۔ ملازم چھل فریب کرنے لگے جس کی وجہ سے کاروبار تباہ ہو گیا۔ کام بند ہو گئے۔ کوٹھیاں اور حویلیاں ویران ہو گئیں۔ مُصیبتوں، تکلیفوں اور اُداسیوں نے گھروں میں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ڈیرے ڈال دئے۔ ملازموں نے گھر کی عورتوں کو ذِلّت اور رسوائی کی کھائی میں دھکیل دیا۔ چوہدری کو اپنی بوئی ہوئی فصل پر بڑا ناز تھا لیکن اُس کے اوزار بھی ڈھیلے نکلے اور دانے بھی گیلے نکلے۔ اُس کے اُجاڑ مندر کے نیولے پُجاری بن بیٹھے۔ سب کُچھ ختم ہو گیا۔ عدالتی پیشیاں شروع ہو گئیں۔ گواہوں کے بیان لیے جانے لگے۔ وکیل بحث کرنے لگے۔ تاریخیں پڑنے لگیں۔ گواہوں پر جرح ہونے لگی اور وقت گزرتا گیا۔ لاڈی اور اُس کے دوست رنجیدہ تھے۔ چوہدری اور اُس کے بھائی اور برخاست اہلکار جیل میں سڑنے لگے۔ چوہدری بیمار رہنے لگا۔ اُسے ذیابیطس کے موذی مرض نے جکڑ لیا تھا۔ جس کی وجہ سے دِل، جگر، اور گُردے بھی متاثر ہو رہے تھے۔ کُچھ ایسا ہی حال باقی مُلزموں کا بھی تھا۔ پولیس کبھی اُنھیں ہسپتال لے کر جاتی، کبھی عدالت اور پھر جیل کی سلاخوں کے اندر۔ معمول کا یہ آنا جانا لگا رہا۔ اِس طرح مقدمے میں پانچ سال بیت گئے۔ آخر عدالت نے اپنا فیصلہ سُنا ہی دیا۔ لاڈی کو پھانسی کی سزا سُنائی گئی۔ قاتل کا ساتھ دینے کے جُرم میں اُس کے دونوں دوستوں کو پانچ پانچ سال کی قید ہوئی مُلزم کو بچانے اور قتل کے ثبوتوں کو مٹانے کے جُرم میں چوہدری اور اُس کے بھائیوں کو سات سات سال کی سزا اور اِس سازش میں ملوث برخاست شُدہ ضلع پولیس افسر، تھانیدار اور مُنشی کو چار چار سال اور فورنسک لیبارٹری کے دونوں ملازموں کو تین تین سال کی قید کی سزا سُنائی گئی۔ نچلی عدالت کے فیصلے کو ہائیکورٹ اور سُپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا لیکن بڑی عدالتوں نے بھی نچلی عدالت کا فیصلہ برقرار رکھا اور یوں سارا کھیل ختم ہو گیا۔ آس اُمید کے خالی پیالے ٹُوٹ گئے۔ چوہدری کی دُنیا قانون نے لوٹ لی۔ اُس کا پیسہ کُچھ نہ کر سکا۔ اُس کے پالتو بے بس ہو گئے۔ چاروں اطراف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اُس کا کُچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

لاڈی، اُس کا بیٹا پھانسی لگنے کے انتظار میں تھا لیکن چودھری اپنے نورِ چشم کو پھانسی پر لٹکتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے لاڈی سے پہلے اپنے آپ کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر ایک دِن جیل واسیوں نے اُس کی لاش کمرے میں لگے پنکھے کے ساتھ لٹکتی ہوئی دیکھی۔ لاش کو شمشان لے جایا گیا۔ اُسے کندھا دینے والے اُس کے بھائی اور اُس کے چند قریبی رشتے داروں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ برخاست شُدہ ضلع پولیس افسر اپنے جُرموں پر پچھتا رہا تھا۔ اُس نے اپنی نوکری کے دوران نہ جانے کتنے بے گُناہوں کا انکاؤنٹر کیا تھا اور انعام اور ترقیاں لی تھیں۔ کتنے لوگوں کو جھوٹے کیسوں میں پھنسایا تھا۔ کتنے ہی بچوں کا اغوا کرا کے رقمیں وصولی تھیں۔ یہی سوچ سوچ کر وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا اور اِس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے آج کل وہ روز گوربانی کا پاٹھ کرتا ہے۔ سب قیدیوں کو اکٹھا کر کے اُنھیں فریدؔ بانی، کبیر بانی اور دوسرے سنت، صوفیوں کا کلام سُناتا ہے اور اُنھیں سمجھاتا ہے:

؎ روٹی میری کاٹھ کی لاون میری بھکھ
جنہاں کھادی چوپڑی گھنے سہن گے دُکھ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

پسِ دیوار

ہر شخص دیواروں کا محتاج ہوتا ہے۔ دیواریں۔۔۔ تعلقات کے بیچ کھڑی کرنے کے لیے۔ کمپلیکس کے سرابوں میں حفاظت سے اُڑان بھرنے کے لیے۔ دیواریں، مقصد پورا کرنے کے بعد مکارانہ فطرت کی تسکین کے لیے۔۔۔ اور دیواریں۔۔۔ بہارِ رُت کو گونگی اور اندھی خزاں سے بچانے کے لیے۔۔۔ دیواریں شبنم کے قطروں کے بچاؤ کے لیے، جو ہاتھ لگتے ہی اپنی دوشیزگی گنوا بیٹھتے ہیں۔۔۔ اگر بہارِ رُت کو دیوار کا سہارا نہ ملے تو اِس کا بھی وہی حشر ہوگا جو آج اُس عورت کا ہے جس کے بے حس جسم کو وں نے بُری طرح نوچ ڈالا ہے۔ اِس نے بڑی مُشکل سے کوّوں کو اپنے جسم سے اُڑایا ہے لیکن کوّے پھر کوّے ہیں۔ وہ لاوارث جسم کو دیکھ کر چیلوں اور گِدھوں کو بھی دعوتِ طعام دے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عورت بھی ایک دیوار کی محتاج ہے۔ بہت زیادہ محتاج۔۔۔ فطرت یزداں کی طرف سے اِنسان کے لیے بخشش ہے۔۔۔ اِس لیے فطرت تبدیل نہیں ہوا کرتی۔ گوشت کو نوچنا کوّوں کی فطرت ہے اور دیوار کی خواہش کرنا ہر عورت کی فطرت۔۔۔ امّاں حوّا کے سفر سے لے کر اِس عورت کے سفر تک اِس فطرت کی کرم فرمائی کی کئی کڑیاں ہیں۔۔۔ اِن کڑیوں میں اُلجھ کر وہ عورت بھی مُرادوں کی منزل سے کوسوں دور رہی ہے۔ پنچ تنتر میں ہے:

''ایک خونخوار شیر بوڑھا ہونے پر گلے میں مالا ڈال کر پرہیزگار بن گیا اور

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جنگل کے ایک کونے میں بیٹھ کر پرماتما کی عبادت کرنے لگا۔ جب کوئی اکیلا دوکیلا جانور شیر کے پاس نیاز حاصل کرنے کے لیے آتا تو وہ اُسے ایک ہی جھپٹے میں ہلاک کر کے اپنا نوالا بنا ڈالتا۔ ایک دفعہ ایک بلّی نے شیر کے ڈھونگ کا پردہ فاش کر دیا۔ وہ گھومتی گھامتی اُدھر سے گزری کہ اچانک اُسے ایک کنویں سے ہڈیوں کی بو آئی۔ اِس نے جب کنویں میں جھانکا تو اُسے شیر کی کرتوت کا پتہ چل گیا۔''

یہ قصہ تو بہت پُرانا ہے لیکن الفاظ تر و تازہ ہیں۔ اِن میں صدیوں پُرانے لباس کی باس نہیں ہے۔ پرہیزگاری کی آڑ میں بوڑھے شیر آج بھی شکار کھیلتے ہیں اور وہ عُمر رسیدہ فنکار جس نے اِس عورت کو سب سے پہلے شکار بنانے کے لیے اپنے فنکارانہ ترکش سے مُنقش تیر پھینکا تو وہ سیدھا اُس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

''تم بہت خوبصورت ہو۔ ہونہار ہو۔ قابل ہو۔ ہر موضوع پر کُھل کر بات کر سکتی ہو۔ تمہارا مطالعہ وسیع ہے۔ آج کی نوجوان نسل میں اِس چیز کی بہت کمی ہے، خاص کر لڑکیوں میں۔ بی اے، ایم اے اور پی ایچ دی کی ڈِگری ہوتے ہوئے بھی موجودہ نسل صحیح ڈھنگ سے گُفتگو نہیں کر سکتی۔ کسی بھی موضوع پر بات کریں، آپ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو کورا ہی پائیں گے۔۔۔ ایسے ماحول میں تم جیسی لڑکی کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ یہ تمہاری قابلیت کا نتیجہ ہے کہ آج اعلیٰ سرکاری عہدہ پر براجمان ہو''۔

''جی شُکریہ! دراصل اِس میں ماحول کا بھی بہت دخل ہوتا ہے۔ میرے والد مُلک کے مشہور وکیل تھے۔ اُنھیں ادب، فلسفہ اور تاریخ سے خاص لگاؤ تھا۔۔۔ مَیں بچپن سے ہی درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ کتابیں بھی پڑھ لیا کرتی تھی جو میرے والد پڑھنے کے لیے لاتے تھے۔ اِن کی ذاتی لائبریری میں دو ہزار سے بھی زائد کتابیں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہیں۔۔۔ میرے بھائی ایک مشہور انجینئر ہیں۔ مُلک کی دشوار گزار سڑکیں اِنہی کی نگرانی میں تعمیر ہوئی ہیں۔ اِس کے علاوہ وہ ایک ماہر آرکیٹیکٹ ہیں۔ ہمارے شہر کی فلک بوس عمارتوں میں کم از کم ایک چوتھائی کے نقشے اُنھوں نے بنائے ہیں۔۔۔ مجھے تاریخ اور فلسفے سے بے حد دلچسپی ہے''۔

وہ باتیں کر رہی ہے۔۔۔ بوڑھے فنکار کی ماہر نظریں اِس کے جسم کے ایک ایک زاویے کو ٹٹول رہی ہیں۔ اُس کی آنکھوں کے اندر چھپی ہوئی بھوک، تڑپ، آرزو۔۔۔ پلکوں پر آجاتی ہے اور کبھی کبھی پلکوں سے باہر بھی جھانک لیتی ہے۔

''اِس سرکاری عہدے پر میں میرٹ کی وجہ سے آئی ہوں۔ مَیں نے کمپٹیشن میں حصہ لیا اور ٹاپ کیا۔۔۔ باقی آپ کی حوصلہ افزائی کا شُکریہ۔ ہاں! آپ کے بیٹے کا کیس منظوری کے لیے بھیجا ہے۔ ہم نے سفارش کر دی ہے کہ آپ کا بیٹا آنتوں کا ماہر ڈاکٹر ہے اور مزید تعلیم کے لیے امریکہ جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہمیں اِس کی خواہش کو دبانا نہیں چاہیے بلکہ اِسے جانے کی اجازت دے دینی چاہیے تاکہ واپس آنے کے بعد وہ اپنے دیش واسیوں کی بہتر سیوا کر سکے''۔

''مِس نازیہ! اِس سے ملو، یہ میرا بیٹا ہے۔ ڈاکٹر ہندال حیدر۔ کل اِس کا جنم دِن ہے۔ ہم تمہیں انوائٹ کرنے آئے ہیں۔ کل رات تم ڈِنر ہمارے ہاں ہی لوگی۔ مَیں نے اپنے گھر کا ایڈریس تو تمہیں بتا ہی دیا ہے''۔

''لیکن۔۔۔''

''لیکن ویکن کُچھ نہیں۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ مَیں نے اپنے بیٹے سے تمہارا کئی بار ذکر کیا ہے۔ یہ بھی تم سے ملنا چاہتا تھا۔۔۔ اِس لیے یہ بھی ساتھ چلا آیا۔۔۔ اِس طرح تعلقات بڑھتے ہیں۔۔۔ ہاں تم اپنے بڑے بھائی انجینئر صاحب کو

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بھی ساتھ لیتی آنا''۔

تعلقات بڑھتے گئے۔ آخر ایک دِن بوڑھے فنکار کا چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر جا لگا۔

''مِس نازیہ! ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمیشہ کے لیے ہمارے قریب آجاؤ۔ میرا بیٹا تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے۔ دِل و جان سے چاہتا ہے۔ میری پسند بھی صرف تم ہی ہو۔۔۔ تم اِس سے کئی بار مل چکی ہو۔ اُس کی خواہش ہے کہ وہ امریکہ جانے سے قبل ہی شادی کرے۔۔۔ تمہاری کیا کرضی ہے''۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اِس معاملہ میں آپ میرے بھیا سے بات کر لیں''

مِس نازیہ۔۔۔ مسز ہندال حیدر بن گئی۔۔۔ بوڑھا فنکار بے حد خوش ہے۔ اُس میں نئی جوانی آگئی ہے۔ اِس کے اندر جذب ہو چکی شوخیوں کو پَر لگ گئے ہیں اور پَرمن پنجرے میں پھڑ پھڑانے لگتے ہیں۔ وہ ہر رات کو نازیہ اور حیدر کے بیڈ روم میں جھانکتا رہتا ہے۔ اُن سوراخوں سے جو دِکھائی نہیں دیتے۔۔۔ نازیہ اور حیدر اُس کے لیے تسکین کا سامان پیدا کرتے رہتے ہیں۔ وہ نازیہ کے جسم کے زاویوں کا افسانہ پڑھتا رہتا ہے اور پھر اپنے بدن کا منوں بوجھ لے کر بیڈ روم میں آجاتا ہے اور اپنے بستر کے پھیکے سفر پر گامزن ہو کر کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔۔۔ اب ہر روز اِس کے تن کے صحرا میں بگولے اُٹھتے ہیں جنہیں ہر رات وہ راکھ میں ٹھنڈا کرتا ہے۔

پھر ڈاکٹر ہندال حیدر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ چلا گیا اور نازیہ اپنے دفتر کے بعد گھر میں بوڑھے فنکار کے ساتھ رہنے لگی۔۔۔ اور پھر ایک رات۔۔۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

نازیہ کے تپتے بیسا کھ کو بوڑھا فنکار اپنی واسنا سے بھرے بن باس میں اُٹھا کر لے گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں، اپنی بانہوں میں چاند کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ پر چاند اُس کی اُنگلیوں سے پھسل جاتا۔ بار بار پھسلن سے چاند نیچے گر گیا اور بوڑھے فن کار کی مُٹھی میں آ گیا۔ وہ بولا:

''وہ مکان جس کی چھت پر برف پڑی ہو اِس کے اندر بھی آگ جلتی ہے۔۔۔''

بستر کے پھیکے سفر کی یاترا سپھل ہوئی۔۔۔ الاؤ روشن ہوا اور پھر اندھے کنویں میں جا کر بکھر گیا۔۔۔ نازیہ کے سُلگتے جسم کو آنکھوں کا ساون رِم جھم سے ٹھنڈا کرنے لگا اور پھر اُس نے بوڑھے فنکار کے مہذب ڈرائنگ روم سے نکل کر بار روم تک جانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ پھر بھی وہ سُلگتی رہی، اُبلتی رہی اور بکھرتی رہی۔۔۔ بوڑھا فنکار کسی اور تصویر کو مکمل کرنے میں مگن ہو گیا اور نازیہ جلتی تنہائی کو آتے جاتے موسموں میں گُم کرنے لگی۔۔۔ لیکن سورج، چاند ستارے پی جانے کے بعد بھی وہ پیاسی رہی۔۔۔ بوڑھے فنکار نے اُسے بدچلنی کے گھوڑے پر سوار کر کے اپنے گھر سے روانہ کر دیا۔۔۔ نازیہ روایت سے نہیں ٹکرائی۔ اِس نے سماج کی فضول رسموں کو بالائے طاق رکھ کر سُلگتی ویرانی کو اپنا نشیمن بنا لیا۔۔۔ اور پھر اِس کے نشیمن پر آئے دِن بگولے حملے کرتے رہے۔ وہ ہر حملہ سہتی رہی۔۔۔ دُکھ ایک پل کا بھی ہو تو عمروں لمبا ہو جاتا ہے اور جب یہ طویل ہو، تب یگوں میں پھیلنے لگتا ہے۔۔۔

''یگوں میں پھیلے درد کے دریا کی لہروں کو شانت کرنے کے لیے وہ ایک دیوار کا سہارا ڈھونڈنے لگی تا کہ وہ قلعہ بند ہو جائے اور ہزار ہا سروں والے اور بے شُمار

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہتھیاروں سے لیس آسیب پل پل اِس کا پیچھا نہ کر سکیں لیکن اُسے ہر بار۔۔۔ کچی دیواروں سے ہی واسطہ پڑا جو مقصد پورا ہونے کے بعد ہی گر جاتیں۔۔۔ اور۔۔۔ اِس کے نشیمن کے صحن میں پھر سے رستے بننے لگتے۔۔۔ ایک پائدار دیوار کی خواہش میں وہ آج بھی بھٹک رہی ہے۔ تن کا صحرا لیے۔۔۔ اور اِس صحرا کے لیے دِکھائی دینے والا ہر نخلستان ایک سراب ہے۔۔۔"

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بے گونج صدائیں

''مائی! تمہارے گھر میں مولوی آئے تھے؟'' میجر شرما اپنے جوانوں کے ساتھ گاؤں میں گھر گھر تلاشی لیتا ہوا بوڑھی نوراں سے پوچھ تاچھ کر رہا تھا۔ فوجی مخبر نے اُنھیں پکی اطلاع فراہم کی تھی۔

''ماں واری جائے میرے بیٹے! ہاں آئے تھے۔'' بے بے نوراں نے جواب دیا۔

''کتنے مولوی آئے تھے؟'' میجر شرما نے تفتیش جاری رکھی۔

''مَیں صدقے جاؤں میرے لعل! وہ چار تھے۔''

''اُن کے پاس کیا کیا سامان تھا۔''

''اُن کے پاس بندوقیں تھیں۔ دو کے پاس پستول بھی تھے اور دونو جوانوں کے ہاتھوں میں ریڈیو بھی تھے۔ جن کے ساتھ وہ کسی سے بات چیت کر رہے تھے۔'' بے بے نوراں بولی۔

''اُن کا حُلیہ کیسا تھا؟''

''اُنہوں نے تمہاری طرح شلواریں اور قمیصیں نہیں پہنی تھیں۔ وہ تو فوجی وردی میں ملبوس تھے۔ وہ لمبے قد اور مضبوط جسم والے تھے۔ اُن سب کے بال لمبے اور داڑھیاں تھیں۔'' بے بے نوراں میجر شرما کو اُن کا حُلیہ بتا رہی تھی۔ وہ اِس بدنصیب گاؤں کی سب سے معمر خاتون تھی، جہاں کے آسمان پر اکثر چیلیں پرواز کرتی رہتی ہیں۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''میرے بچو تم کھانا کھاؤ گے۔ چائے پیو گے؟'' بے بے نوراں چارپائی پر سفید چادر بچھاتے ہوئے میجر شرما سے پوچھ رہی تھی۔

''نہیں نہیں! ہم چائے نہیں پئیں گے، لیکن یہ بتاؤ! کیا تم نے اُن کو کھانا کھلایا تھا؟'' میجر شرما نے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بیٹا! مَیں نے اُن کو کھانا کھلایا تھا۔ اُن کو بھوک لگی تھی اور اُنھوں نے مجھ سے کھانا مانگا تھا۔ مَیں نے اُنھیں روٹی کھلائی، پانی پلایا اور پھر وہ اُپر والی پہاڑی کی طرف چلے گئے۔'' اُس نے پیر پنچال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

پھاگلہ گاؤں کا یہ علاقہ بڑا پسماندہ ہے۔ یہاں اکثر ملی ٹینٹ آتے جاتے رہتے ہیں کیوں کہ یہیں سے ایک راستہ پیر پنچال پہاڑی سلسلہ کی طرف جاتا ہے اور دوسرا راستہ بفلیاز، ڈیرہ گلی، تھنہ منڈی اور دریائے بُدھل سے ہوتا ہوا۔ بدھل وضلع اُدھم پور کے پہاڑی علاقوں مہور اور گول کے لیے جاتا ہے۔ جبھی تو اِس سارے علاقے میں عسکریت پسندوں کا جماؤ رہتا ہے جس کے کارن پولیس اور فوج اکثر اِس علاقے کا محاصرہ کر لیتی ہے۔ یہاں ملی ٹینٹوں کے ساتھ اِن کے مقابلے ہوتے رہتے ہیں جن میں دونوں اطراف کا جانی نقصان ہوتا رہتا ہے اور اِس کی لپیٹ میں دیہاتی بھی آتے رہتے ہیں۔ گاؤں والوں کا جانی اور مالی نقصان ہر روز ہوتا ہے۔ کبھی ملی ٹینٹوں کے ہاتھوں اور کبھی پولیس اور فوج کے ہاتھوں۔ یہ لوگ بڑی مصیبتوں کا شکار ہیں۔ چکی کے دو پاٹوں میں پس رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ ہوئی زیادتیوں کی شکایتیں انتظامیہ کے ساتھ کرتے رہتے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ حالات نے سب کو بے بس بنا دیا ہے۔

''مائی تم نے اُن کو روٹی کیوں کھلائی؟ تم کو پتا نہیں کہ وہ ہمارے دُشمن ہیں۔ وہ دُشمن مُلک سے ٹریننگ لے کر آتے ہیں اور یہاں تباہی مچاتے ہیں۔ معصوم لوگوں کو

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

مارتے ہیں اور تم لوگ اُن کو کھانا کھلاتے ہو۔ اُن کو سونے کے لیے جگہ دیتے ہو۔ یہ ایک سنگین جُرم ہے۔ اِس کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔''

''میرے لعل! میرے جگر کے ٹکڑے! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی میرے گھر بھوکا پیاسا آئے اور مَیں اُسے کھانا نہ کھلاؤں۔ یہ تو ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ ہمارے رواج کے خلاف ہے۔ ہم گاؤں والے گنوار پہاڑی لوگ مسافروں کو کھانا کھلانا، اِن کو رات گزارنے کے لیے جگہ دینا ثواب سمجھتے ہیں۔ یہ رواج ہمارے یہاں صدیوں سے رائج ہے۔ ہم نے اپنے پُرکھوں سے سیکھا ہے۔ کیا تمہارے علاقے میں ایسا رواج نہیں ہے؟ کیا تم لوگ گھر آئے مسافروں کو بنا کھلائے پلائے نکال دیتے ہو۔۔۔ اور یہ دُشمن کون ہے؟ ہمارا تو کوئی دشمن نہیں۔'' بے بے نوراں میجر شرما کو بتا رہی تھی۔

''تم لوگ کھڑے کیوں ہو۔ تم سب بیٹھو۔ یہ چارپائی مَیں نے تمہارے لیے بچھائی ہے۔ میرے بچو! مَیں تمہیں چائے پلائے بغیر یہاں سے نہیں جانے دوں گی۔ میرا خُدا مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ تم بھی تو میرے بیٹے نصیرے جیسے ہو جو آج کل مزدوری کے لیے پنجاب گیا ہوا ہے۔'' اُس نے چائے بنانی شروع کی اور میجر شرما سے پوچھنے لگی۔

''مَیں واری جاؤں میرے بیٹے! تم مجھے یہ بتاؤ کہ اِن مولویوں سے تمہاری کیا دُشمنی ہے؟ وہ بھی جب آتے ہیں تو مجھ سے یہی پوچھتے ہیں کہ یہاں کھتری تو نہیں آئے تھے۔ شاید بیٹا وہ تم لوگوں کو کھتری کہتے ہیں۔ وہ تم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ تم بھی اُن سے بڑی نفرت کرتے ہو۔ اصل بات کیا ہے۔ تم دونوں کیوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہو۔ تمہارا آپس میں جھگڑا کیا ہے؟ میرے لعل تم بتاؤ کہ تم کس

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بات پر جھگڑ رہے ہو؟ مَیں تم دونوں کی صلح کرا دوں گی تا کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ امن و دوستی کے ساتھ رہ سکو اور ایک دوسرے کی جان کے دُشمن نہ ہو۔''

''مائی! وہ ہمارے دشمن ہیں۔ وہ ہمارے کیمپوں پر حملہ کرتے ہیں۔ وہ یہاں کے لوگوں کو مارنے آئے ہیں۔ ہم اِن کو ختم کیے بغیر دم نہیں لیں گے۔'' میجر شرما نے کہا۔

''نہ میرے لعل نہ! ایسا نہیں کہتے۔ بھلا آدم کی نسل کو کوئی ختم کر سکا ہے۔ ہم ہر روز کتنے ہی بھیڑ بکرے کاٹتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ کیا اِن کی نسل دُنیا میں ختم ہوئی۔ جان لینا اور دینا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ایسا قُرآن میں لِکھا ہے۔ بیٹا! لڑائی جھگڑے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لڑائی تباہی کا نام ہے۔ ماؤں کی گود اُجڑ جاتی ہے اور پیار محبت سے زمین میں برکت آتی ہے۔ ہریالی اور خوشحالی ہوتی ہے۔ تم مجھے بتاؤ بیٹا کہ تمہاری آپس میں دُشمنی کیا ہے۔ مَیں تمہارا فیصلہ کروا دوں گی اور اگر مَیں تمہارا فیصلہ نہ کروا سکی تو پھر تمہارا معاملہ علاقے کے چودھری کھٹانا کے پاس لے جاؤں گی۔ وہ ہمارے علاقے کا سب سے بڑا چودھری ہے۔ بڑا نیک اور عقلمند ہے۔ اِس نے دو حج بھی کیے ہیں۔ ہم سب اِس کے فیصلے کو مانتے ہیں۔ تم لوگ بھی میرے ساتھ چودھری کے پاس چلو۔ وہ تم دونوں کا فیصلہ کرا دیں گے۔ بیٹا! آپس میں مت لڑو۔ ایک دوسرے کے پیچھے اِن جنگلوں میں اپنی جوانی برباد مت کرو۔'' بے بے نوراں فوجیوں کو سمجھا رہی تھی اور چائے کے کپ اِن کے ہاتھوں میں تھما رہی تھی۔

میجر شرما بوڑھی نوراں کی باتیں سُن کر مسکرایا۔ اُس نے چائے پی اور اپنی نفری لے کر دوسرے گاؤں کی طرف چل دیا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

حرص کا سفر

مَیں نے آٹے چاولوں کے خالی کنستروں والے گھر سے لے کر اِس بڑی حویلی تک پہنچنے کا سفر بڑی تیزی سے طے کیا ہے مگر پھر بھی میں مطمئن نہیں ہوا کیوں کہ صبر نام کی بوٹی مَیں نے کبھی من کے اندر اُگنے نہیں دی۔ لالچی نفس کو کبھی سچ اور حق کا رس پینے نہیں دیا۔ مَیں نے کوئی ربی سنگت نہیں رکھی اور نہ ہی انحد کی تسبیح پھیری۔ مَیں نے فقر کے ساتھ بھی یاری نہیں لگائی اور نیکی جیسے لفظ کو اپنے دِل سے جوتے پر پڑی گرد کی طرح جھاڑ دیا اور من کے اندر موہ، مایا، کام، کرودھ اور اہنکار کو پالتا رہا اور اپنا کرم کانڈ کرتا رہا۔ مَیں ریشم کی کھپٹی کی طرح اپنے ضمیر پر مکر چکر کا جال بُنتا رہا۔ کاغذی تیتر اور بٹیر میرے چوگرد طواف کرتے رہے۔ مَیں اُن کی چُونچ میں چوگ ڈالتا رہا اور اُنھیں موہ مایا کی گیدڑ سنگھی سُنگھاتا رہا۔

مَیں پڑھا لِکھا بھی تھا اور تجربہ کار بھی۔ مَیں نے شبد سادھنا کی تھی۔ شبد میرے گُورو تھے۔ شبد میرے ہتھیار تھے اور شبد ہی سنسار۔ مجھے اپنی فنکاری سے شبدوں کو رسیلا اور رنگیلا بنانے کا سلیقہ بھی آتا تھا اور دھیلی دے کر حویلی لکھوانے کا گُر بھی۔

مَیں دولت کا دریا پینے لگا۔ میرا پیٹ تو بھر گیا تھا لیکن آنکھیں پھر بھی بھُوکی تھیں میری آنکھیں کوٹھیاں اور حویلیاں دیکھ دیکھ کر تنگ آچکی تھیں اور ایک ایسی اُونچی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

عمارت دیکھنے کی چاہ رکھتی تھیں جو امبر کو چھو سکے۔

پھر مَیں نے ایک ایسی عمارت بنائی جو سورج سے چند قدم دُور تھی۔ اُس بلڈنگ کو دُنیا کا نواں عجوبہ مان لیا گیا تھا۔ خلقت میرے گُن گا رہی تھی۔ اب مَیں خوش تھا اور مطمئن بھی۔ میرے پاؤں دھرتی سے اوپر خلا میں اُڑ رہے تھے۔ مَیں اُڑتا اُڑتا اُس عمارت کی چھت پر جا بیٹھا جو مَیں نے بنائی تھی اور دُنیا کو دیکھنے لگا پَر دُنیا مجھے کہیں دِکھائی نہ دی۔ خلقت کا کوئی وجود نہ تھا۔ صرف مَیں تھا اور کوئی نہ تھا۔ میرا چوگرد خالی تھا۔ دھرتی کے ساتھ میرا رشتہ ختم ہو چُکا تھا۔ مَیں نے زمین پر اُترنے کی لاکھ کوشش کی لیکن مجھے کوئی راستہ نہ ملا۔ مَیں اُونچی عمارت کی چھت پر اکیلا رہ گیا۔ مَیں اپنے ہی کرموں کے فریب میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ وہ اُونچی آسمان کو چھوتی عمارت میرے لیے ایک کال کوٹھڑی بن گئی۔ ایک اندھیری گُپھا، جہاں مَیں قیدی تھا۔ میری ریاکاری اور لالچ کا جال صداقت نے کُتر دیا۔ میرے اندر اُگا اہنکار کا پہاڑ جوالا مُکھی کی طرح پھٹ گیا اور کھپٹی میں بند پڑا میرا مُردہ ضمیر باہر نِکل آیا۔ مَیں پستی اور سیاہ بختی کی حدوں سے باہر نِکلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن میرے کھنڈر سریر کی قبر میں میرا مُردہ ضمیر ٹکڑے ٹکڑے بکھرا پڑا تھا جیسے کیڑے مکوڑے چاٹ رہے تھے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گھر کی جنت

اُس کا نام شہناز تھا۔ سانولا رنگ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، دُبلا پتلا بدن۔ اُس پر اُس کا تنگ لباس۔ جواں دلوں کو گھائل کرتی وہ ہر روز کالج آتی۔ جنرل انگلش کا پیریڈ پڑھتی اور چلی جاتی۔ اُس کے ساتھ اُس کی دو سہیلیاں مدھو اور کملا بھی ہوتیں۔ اُن تینوں کے ہونٹ اکثر کلاس میں رباب بجایا کرتے اور ہم سب لڑکے اِس مدُھر سنگیت میں کھوئے رہتے۔ پروفیسر صاحب کبھی مجھے کبھی کنور کو تو کبھی کسی اور کو بیچ میں ٹوکتے کہ تُمہارا دھیان کدھر ہے۔ وہ ہر پانچ منٹ کے بعد یہی کہتے:

''ویل بوائز۔۔۔ لِسن سیریسلی۔ نوٹاک، نوٹاک۔۔۔ آئی سے نوٹاک۔ یُو بوائے۔۔۔ وئیر آر یُو لُکِنگ۔۔۔

غرض ہمارا جنرل انگلش کا پیریڈ ۵۵ منٹ کا ہوتا۔ پچیس منٹ پروفیسر صاحب کی ٹوکا ٹاکی نذر ہو جاتا۔ یاروں کا تو ذکر ہی کیا۔ اکثر سنجیدہ طبع لڑکے بھی کتاب میں دھیان کم اور اُس کی طرف زیادہ دیتے۔

اُس کے نقش اچھے تھے۔ رنگ چونکہ سانولا تھا اِس لیے وہ ہر روز ہلکا سا میک اپ کر کے آتی۔ ماتھے پر کاجل کی بِندیا لگائے، بالوں کو یوں سنوارے، جیسے کسی دیوار پر خوبصورت بیل ہو۔ اُس کے بالوں میں لگا خوشبودار تیل ساری کلاس کو معطر کرتا۔ وہ کبھی کبھی اپنے بالوں میں گُلاب کا پھول بھی لگاتی۔ دوپٹے کو سینے پہ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سجائے وہ خرامِ ناز جب کالج کے گیٹ پر پہنچتی تو یار لوگ اُس کا سواگت عشقیہ شعروں سے کرتے۔

آنچل ڈھلا رہا میرے مست شباب کا
اوڑھا گیا کبھی نہ دوپٹہ سنبھال کے

اور وہ مسکراتی، بل کھاتی گزر جاتی۔

ہمارے کالج کا نام ری پبلک کالج تھا۔ یہ نائٹ کالج تھا۔ یہاں جنرل اِنگلش، اِنگلش لٹریچر اور پولیٹیکل سائنس کی کلاسیں لگتی ہیں۔ میرا نام عُثمان ہے۔ مَیں ایک ٹیچر ہوں میری ڈیوٹی اُن دِنوں جموں میں تھی۔ مَیں اِس کالج میں جنرل اِنگلش اور اِنگلش لٹریچر پڑھنے آیا کرتا۔ مجھے ٹی ڈی سی فائینل کا امتحان دینا تھا۔ میرے گھر والے بڑے غریب تھے۔ وہ مجھے میٹرک سے آگے نہ پڑھا سکے۔ بڑی کوششوں سے مجھے ٹیچر کی نوکری ملی۔ مَیں نے دورانِ نوکری جموں وکشمیر یونیورسٹی سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ پی یوسی اور فسٹ ائیر ٹی ڈی سی کے امتحان پاس کرنے کے بعد اب مَیں بی اے کے امتحان کی تیاری کے لیے اِس کالج میں داخل ہوا تھا۔ اِس چھوٹے سے شہر میں طلبا کی سہولیت کے لیے بے شُمار نائیٹ کالج کُھلے ہوئے ہیں جہاں وہ اپنی کمی کو پورا کرنے کے لیے تین چار مہینے پڑھتے ہیں۔

میری شہناز سے بات چیت عجیب ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ ایک دِن وہ کالج سے گھر جاتے ہوئے ایک تنگ وتاریک گلی سے گزری۔ اتفاق سے مَیں بھی اُس گلی سے گزر رہا تھا۔ مَیں اُس سے کافی پیچھے تھا۔ اچانک موڑ پر اُس کے چلّانے کی آواز سُنائی دی۔۔۔ بچاؤ۔۔! بچاؤ۔۔۔!! مَیں دوڑا۔ ایک لڑکے نے اُسے اپنے بازوؤں میں جکڑا تھا۔ مَیں نے اُسے للکارا۔ وہ میری طرف پلٹا۔ ہم دونوں میں ہاتھا پائی ہوئی۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بالآخر وہ بھاگ گیا۔ مجھے معمولی چوٹ آئی۔ میرے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہنے لگی:

''مَیں اپنی سہیلی کے ہاں جا رہی تھی کہ اِس غُنڈے نے مجھے پکڑ لیا۔ کیسے بدتمیز ہیں یہ آج کل کے لڑکے۔''

مَیں نے کہا ''مَیں بھی۔''

''نہیں، نہیں! آپ تو فرشتہ ہیں۔ آپ نے تو مجھے بچایا۔ کیا نام ہے آپ کا؟''

''عثمان''

''تو کیا آپ مُسلمان ہیں؟''

''جی ہاں، نام سے تو مُسلمان ہوں''

''ورنہ آج کل کون مذہب پر چلتا ہے۔ آج مذہب ایک مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ صرف اِنسان کو اِنسان سے جُدا کرنے کا آلہ ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں، دُنیا میں بہترین مذہب اِنسانیت ہے۔ جو کسی میں بھی نہیں۔''

''آپ کا کیا نام ہے؟'' مَیں نے بھی یوں ہی بنتے ہوئے پوچھا۔

''شہناز۔''

''بڑا پیارا نام ہے۔ کہاں رہتی ہیں آپ؟''

''جین بازار۔''

''چلیے مَیں آپ کو گھر تک چھوڑ آؤں۔'' ڈاکٹر کی دوکان سے مَیں نے ماتھے پر بنڈیج لگوائی اور اُسے گھر تک چھوڑ آیا۔ اُن کا مکان کافی بڑا تھا۔ ہم دونوں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کی دوستی بڑھتی گئی۔ اب ہم دونوں اکٹھے کالج آتے اور اکٹھے جاتے۔ پروفیسر، سٹوڈنٹ سبھی ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھتے۔ اکثر دوست کہتے، ''یار! ہمارا بھی خیال رکھنا، اکیلے نہ کھا جانا۔''

ہم کبھی کبھی فلم دیکھنے بھی جاتے۔ یہاں جموں میں ایک نہر ہے۔ ہم اکثر وہاں جاتے اور پہروں باتیں کرتے۔ مَیں نے ایک کمرہ اُستاد محلے میں کرایہ پر لیا تھا۔ وہ تقریباً ہر روز میرے پاس آتی۔ اُس کی کشش دِن بدن میری طرف بڑھتی گئی اور ہم ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ ایک دِن اُس نے کہا:

''عثمان! مجھے تم سے محبت ہے۔ مَیں جانتی ہوں کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو لیکن دُنیا والوں سے ڈرتے ہو کیوں کہ مَیں ایک امیر لڑکی ہوں اور تم غریب ہو۔''

''یہ ٹھیک ہے شہناز! لیکن تمہیں عِلم نہیں کہ مَیں شادی شُدہ ہوں۔ میری بیوی ہے۔ مَیں تمہیں بہت پہلے بتا دینا چاہتا تھا لیکن نہ جانے میری زبان کیوں نہ کھلی۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ مَیں تمہیں چاہتا ہوں لیکن شہناز! مَیں دو زندگیاں برباد نہیں کر سکتا۔ اِس لیے مجھے بھول جاؤ۔''

وہ غُصے سے لال ہوگئی۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ بولی:

تم نے مجھے آج تک کیوں نہیں بتایا۔ بدمعاش، کمینے۔ اب مَیں تمہاری صورت کبھی نہیں دیکھوں گی۔'' اور وہ چلی گئی۔ مَیں کالج آتا رہا۔ وہ بھی آتی رہی۔ ہمارے امتحان میں صرف دو ہفتے باقی تھے۔ مَیں امتحان کی تیاری میں مصروف تھا لیکن کتابوں میں دِل نہیں لگتا تھا اور اکثر سر درد رہتا۔

امتحان شروع ہوا۔ ابھی دو پرچے باقی تھے۔ بیچ میں تین چُھٹیاں تھیں۔ ایک

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دِن شہناز میرے ہاں آئی۔ وہ آتے ہی رونے لگی اور بھرائی آواز میں بولی:

''جانے تم نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے۔ ہر وقت تمہاری صورت آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔ عثمان! یہ جان کر بھی کہ تم شادی شُدہ ہو، مَیں تم سے محبت کرتی ہوں۔'' وہ پھر رونے لگی۔ مَیں نے اُسے گلے لگایا۔ آنسو پونچھے اور کہا:

''شہناز! اگر تم اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو تو مَیں تمہارا ساتھ پوری طرح نبھاؤں گا۔'' مَیں نے اُسے فلم دیکھنے کے لیے کہا۔ وہ مان گئی۔ شام کو جب اُسے گھر چھوڑتا ہوا مَیں اپنے کمرے میں پہنچا تو مجھے اپنی بیگم کا خیال آیا۔ وہ کتنی محبت کرتی ہے مجھ سے۔ اُس نے میرے لیے اپنے ماں باپ، مال و جائداد سب کو چھوڑ دیا تھا۔ اُس کے ابا مجھ سے شادی کے لیے راضی نہ تھے لیکن بیٹی کی ضد کے آگے اُنھوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ میری بیگم کا نام فردوس ہے اور وہ کسی فردوس سے کم حسین نہیں ہے۔

ہمارا امتحان ختم ہوا۔ ایک دِن شہناز اُداسی کے عالم میں میرے پاس آ کر کہنے لگی:

''عثمان! اب میرا دِل یہاں بالکل نہیں لگتا۔ آؤ کہیں بھاگ چلیں۔''

''بھاگ چلیں۔'' مَیں چونکا۔

''ہاں دُور! بہت دُور، جہاں ہمیں کوئی نہ پہچانے۔ مَیں اپنا اور ممی کا زیور تک لانے کو تیار ہوں۔ ہم دونوں پڑھے لکھے ہیں۔ نوکری کریں گے اور مزے سے زندگی بسر کریں گے۔''

''لیکن شہناز میری بیوی کا کیا بنے گا۔''

''اُسے ہم ہر ماہ پیسے بھیج دیا کریں گے۔''

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''دیکھو عثمان! اِنکار نہ کرنا ورنہ مَیں کبھی تمہاری صورت نہیں دیکھوں گی۔''

اُس نے مجھ سے اقرار لے لیا۔ ہم نے پروگرام بنایا۔ اگلی صُبح ہم بھاگ چلیں گے۔ اُس کے جانے کے بعد میں سوچتا رہا۔ کیا میری بیوی کو صرف پیسوں کی ضرورت ہے؟ کیا اُسے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں؟ مجھے وہ تمام عہد و پیمان یاد آنے لگے جو مَیں نے فردوس سے کیے تھے۔ مجھے میرے ضمیر نے جھنجھوڑا۔ مَیں نے اُسی وقت گاڑی پکڑی۔ اگلی صبح مَیں اپنے گھر تھا، اپنی فردوس کے پاس۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جمہوریت

یا اللہ! مَیں نے کون سے گُناہ کیے ہیں کہ اِن پہاڑوں کی خاک چھاننی پڑ رہی ہے۔ راستہ ہے کہ ختم ہونے کو ہی نہیں آتا۔ ہم ٹھہرے شہری بابو، اگر آدھا کلومیٹر کا سفر بھی کرنا ہو تو سکوٹر، رکشا یا ٹیکسی کے بغیر قدم بھی نہیں اُٹھاتے، پر اب تک چالیس کلومیٹر سے بھی زیادہ پہاڑی راستہ پیدل طے کر چکا ہوں لیکن وہ گاؤں ابھی تک نہیں آیا جہاں میری الیکشن ڈیوٹی لگی ہے۔ چیڑ، دیودار، پھلائی، سنبل، کیلا اور شیشم سے بھرے جنگلوں میں پگڈنڈی بل کھاتے ناگ کی طرح ڈس رہی ہے۔ انس، پلّسو اور شیر گڑھی کی ندیاں اپنے عاشق چناب سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ دور سامنے کوثر ناگ کا نیلا پانی سورج کو نہلا رہا ہے۔ پیر پنچال نے اپنے جسم پر برف کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔ سردی اتنی شدید ہے کہ کانگڑی جم جائے مگر سہاڑھ، دیول، لدّ کی پگڈنڈیوں نے میرا خون جمنے نہیں دیا۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہے اور مَیں چل رہا ہوں۔

مجھے گھر سے نکلے آج سات دِن ہوئے ہیں۔ مجھے اسمبلی کے حلقہ گُلاب گڑھ کے پولنگ سٹیشن نمبر 28 کا پریزائیڈنگ افسر لگایا گیا ہے۔ ارناس میں ریٹرننگ افسر کی طرف سے ضروری احکامات اور الیکشن کا سامان لینے کے بعد مَیں اپنے پولنگ سٹیشن شدول کی طرف چل پڑا ہوں۔ مہور سے میرے گاؤں کا چوکیدار اور دو پولنگ افسر بھی آ ملے۔ یہ دونوں سکول ماسٹر ہیں۔ اِسی علاقہ کے رہنے والے ہیں۔ میرے پوچھنے پر وہ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اپنے علاقہ کے بارے میں بتلانے لگے:

''بابو جی! بھوک اور بیماری ہمارے لوگوں کو ورثہ میں ملی ہے۔ زمین کی فصل پٹواری سے لے کر تحصیلدار کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ پہلے جاگیرداری نظام چلتا تھا، اب یہاں تحصیلداری نظام چلتا ہے۔ اِکا دُکا کہیں کوئی ڈسپنسری بھی ملتی ہے لیکن دوائیوں کے بغیر۔ نیم حکیم کمپاؤنڈروں کو یہاں ڈاکٹر کہتے ہیں جو اول تو ڈسپنسریوں میں ہوتے ہی نہیں اور اگر خُدانخواستہ کبھی ڈیوٹی پر حاضر بھی ہوں تو یہ بیمار کو دیکھنے یا دوائی دینے سے اِنکار کر دیتے ہیں۔ ہاں! اگر کوئی دیسی گھی، کمبل یا مُرغا اِن نام نہاد ڈاکٹروں کو پیش کرے تو اُس بیمار کو ایک ایسا ٹیکہ لگاتے ہیں کہ سارے دُکھ دور ہو جائیں۔ بیماری کا نام ونشان نہ رہے۔ دیکھیے بابو جی! ہمارے یہ مکان۔'' وہ راستے میں بنے کچے مکان مجھے دِکھانے لگا۔

''ایک ہی کمرے میں گھر کے سارے افراد بھی رہتے ہیں اور مال مویشی بھی۔ تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہماری تقریباً ساری آبادی ان پڑھ ہے۔ بابو جی ہمیں آزاد ہوئے نِصف صدی گزر گئی ہے۔ ہمارے ملک میں جمہوریت ہے۔ ہر پانچ سال کے بعد یہاں چناؤ ہوتے ہیں۔ ہمارے اپنے نمائندے حکومت کرتے ہیں پَر یہ بھوک، بیماری اور بے روزگاری کو دور کیوں نہیں کر پاتے۔ اِن کے کھوکھلے نعرے سادہ لوح بندوں کو ورغلانے کے لیے ہی کیوں ہوتے ہیں۔ کب مٹے گی غریبی؟ ہم تو غریب کو ہی مٹتے دیکھ رہے ہیں۔ بابو جی! دوسرے ملکوں میں لوگوں کو اُن کا حق دلانے کے لیے زوردار آوازیں بُلند کرنے والے اپنے لوگوں کو کب اُن کے حقوق بخشیں گے؟ ہمارے ووٹ اور ہماری سادگی کے ٹھکیدار۔۔۔ ''چڑھتا سُورج''، ''ہاتھ''، ''سائیکل''، ''ہلدھر کسان''، ''کنول کا پھول''۔۔۔ ترقی کی نشانی۔ ''چڑھتا سُورج''۔۔۔ ووٹ کا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

حقدار، آپ کے سارے مسائل حل ہوں گے۔'' ''ہاتھ۔۔۔غریبی مٹانے اور دیش کو بچانے کے لیے اپنا قیمتی ووٹ ہاتھ کو دیں۔'' ''تانا شاہی مٹانی ہے، ہلدھر پر مہر لگانی ہے۔'' یہ تقریریں سُن سُن کر تو ہمارے کان پک گئے ہیں لیکن نہ تو ہمیں عزت کا مقام ملا ہے نہ ہماری غریبی دُور ہوئی ہے۔''

''ماسٹر جی! پر یہ کیوں کر دُور ہوگی؟'' مَیں نے پوچھا۔

''بابو جی! ہمیں امیر غریب کا فرق مٹانے کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔ کوئی ٹھوس تبدیلی لانا ہوگی۔ میرا مطلب ہے۔۔۔'' دوسرے ماسٹر نے اُس کی بات کاٹ دی اور بولا:

''بابو جی! ہمیں سارا نظام بدلنا ہوگا۔ ہمیں ایک نیا انقلاب لانا ہوگا۔''

''پر انقلاب کے نعرے تو پہلے بھی گونجتے رہے ہیں۔ سماج واد کا راستہ تو پہلے بھی دِکھایا جاتا تھا۔ مگر کیا انقلاب آیا؟''

''انقلاب بابو جی جبھی آئے گا جب عوام ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہوں گے۔ جب اِنسان کا ضمیر جاگے گا۔ ہمیں عوام کو تیار کرنا ہوگا۔ اِس نظام کے خلاف، کورپشن، بھائی بھتیجا واد، مذہبی جنون اور دہشت گردی کے خلاف، جس نے زندگی کو سخت پریشان بنا دیا ہے۔ ہمیں لوگوں کو اچھے اور بُرے کی تمیز سِکھانا ہوگی۔ آج سارے دیش میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ سِکّے کا پھیلاؤ، روپے کی قیمت نہ ہونے کے برابر، مہنگائی، آئے دِن قیمتوں میں اضافہ، کمر توڑ ٹیکس، اشیائے ضروریہ کا کال سب کچھ اِس گندے نظام کی دین ہے۔ یہ سب بدلنا ہوگا۔ ہمارا سیاسی نظام سودے بازی کی دین ہے۔ سودے بازی سرمایہ دار اور جمہوریت کا ڈھول پیٹنے والوں کے درمیان۔ سودا طے ہوتا ہے، غریب کا خون نچوڑنے کا۔ بابو جی! سرمایا دار جمہوریت کے ان داتا ہیں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اور پرجاتنتر کو زندہ رکھنے والے دیوتے ہیں۔ یہ چناؤ کے خریدار ہیں۔ یہ پیسہ دیتے ہیں۔۔۔ سوگنا سود پر۔۔۔ اور اُسے چندے کا نام دیا جاتا ہے۔ کچھ نوکریاں، کچھ سکول، کچھ ڈسپنسریاں، کچھ سڑکیں اور کچھ اور وعدے۔ اِس طرح الیکشن ختم اور جمہوریت زندہ باد۔''

یہی باتیں کرتے کرتے ہم اپنے پولنگ سٹیشن پہنچ گئے۔ آج پولنگ کا دِن ہے۔ لوگ ووٹ ڈالنے آرہے ہیں۔

''بیٹا ہم کہاں مہر لگائیں؟''

''جہاں تمہاری مرضی بابا۔''

''ہمیں کیا پتہ، تم جہاں چاہو بابو خود لگالو۔''

''اوہ، بھائی مہر ووٹ والے کاغذ کی پچھلی طرف نہیں لگاتے۔ یہ سامنے جو بارہ نشان دِکھائی دے رہے ہیں نا، اِن میں سے اُس نشان پر مہر لگا دو جہاں تمہاری مرضی ہو۔''

''ہماری کیا مرضی صاحب! جہاں جناب فرمائیں گے، وہاں لگا دوں گا۔ مجھ کو سرپنچ نے کہا ہے کہ مہر ہاتھ پر لگاؤ۔ کہاں ہے بابو ہاتھ۔ مجھے دِکھانا، ذرا جلدی ہے۔ گھر میں بھینس بھوکی ہے۔''

دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں چناؤ ہو رہے ہیں۔ لوگ ووٹ ڈال رہے ہیں۔ اپنا قیمتی ووٹ، ''آزادی، لوک راج، خوشحالی کی نشانی۔''

''بابو جی ہمیں ایک نیا انقلاب لانا ہوگا۔'' ''ہم کو یہ نظام بدلنا ہوگا۔'' اور مَیں کُرسی پر بیٹھا اپنی ڈیوٹی دے رہا ہوں۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کھنڈر ضمیر

''جناب والا! میرے ساتھ جتنے بھی عارضی ایس پی او لگے تھے، وہ سبھی خصوصی پولیس اہلکار آپ نے مُستقل سپاہی بنوا دیے۔ کئی سپاہیوں کو آپ نے سلیکشن گریڈ کانسٹیبل اور کئی کانسٹیبلوں کو ہیڈ کانسٹیبل بنوا دیا۔ آپ کی سفارشات نے کچھ سب انسپکٹروں کو انسپکٹر بھی بنا دیا۔ صرف مَیں رہ گیا۔ حضور مجھے بھی کانسٹیبل بنوا دیں۔ سبھی آپ کے گُن گاتے ہیں۔ پولیس لائن میں سب آپ کی تعریف کرتے ہیں۔ مہربانی کر کے مجھے بھی مستقل سپاہی بنوا دیں۔ میرے بارے میں بھی ڈائریکٹر جنرل صاحب کو سفارش کر دیں۔ مَیں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔'' ایس پی او اقبال اپنے سُپرنٹنڈنٹ پولیس سے التجا کر رہا تھا۔

آتنک واد کو جڑ سے اُکھاڑنے کے لیے جہاں فوج، پیرا ملٹری فورس اور پولیس بڑی بہادری سے دہشت گردوں کے خلاف لڑ رہی تھی، وہاں سرکار نے ہتھیار ڈالنے اور قومی دھارا میں شامل ہونے والے سابقہ ملی ٹینٹوں اور بے کار نوجوانوں کو بھی عارضی طور پر بھرتی کیا ہے تا کہ آئی ایس آئی اور پاکستان کے ناپاک عزائم کو ناکام بنایا جا سکے۔ فوج اور پولیس کے جوانوں کو اُگروادیوں کو مارنے اور بہادری کے کارنامے دِکھانے پر تمغے ملتے، ترقی دی جاتی اور نقد انعام بھی ملتا اور عارضی بھرتی کیے گئے ایس پی او مستقل سپاہی بنا دیے جاتے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''اقبال جب سے تم بھرتی ہوئے ہو تم نے کوئی بہادری کا کارنامہ نہیں دِکھایا اور نہ ہی تمہارے ہاتھوں آج تک کوئی ملی ٹینٹ مرا ہے۔ پھر مَیں تمہاری سفارش کیسے کر سکتا ہوں۔ پہلے کسی دہشت گرد کو مارو یا زندہ پکڑو پھر اپنے لیے کچھ مانگو'' ایس پی صاحب نے اقبال کو سمجھایا۔

''حضور! مَیں بھی تو ہر کاروائی میں ساتھ ساتھ رہا ہوں۔ جہاں بھی آپ نے مجھے بھیجا مَیں وہاں گیا۔ ایکشن کاروائی میں حصہ لیا۔ آپ کا حکم بجالایا۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ میرے ہاتھوں کوئی ملی ٹینٹ نہیں مرا لیکن جناب! پرسوں جب ہماری ٹکڑی نورگلی میں گشت لگا رہی تھی تب مَیں نے ایک آتنک وادی کو جنگل میں چھپے ہوئے دیکھا۔ میرے للکارنے پر اُس نے اپنی بندوق سے فائرنگ شروع کر دی اور دو ہتھ گولے بھی پھینکے۔ چونکہ مَیں نے پوزیشن لے رکھی تھی، اِس لیے وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا، جب کہ مَیں نے نشانہ باندھ کر گولی چلائی اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ مَیں نے اُس سالے کو چٹکھا دیا تھا۔''

''اُس کی بندوق کہاں ہے اور لاش۔۔۔؟'' ایس پی صاحب نے پوچھا۔

''جناب! بندوق شاید اُس کے ساتھی لے گئے ہیں، لیکن وہ لاش وہیں چھوڑ گئے تھے۔''

''اقبال تمہاری کہانی میں کوئی دم نہیں لگتا۔ تمہاری بات کا کیسے یقین کیا جائے۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ اُس آتنک وادی کو تم نے ہی مارا ہے؟'' ایس پی صاحب نے پوچھا۔

''ہاں جناب ہاں! میرے پاس پکا ثبوت ہے۔ مَیں آج ثبوت کے ساتھ آپ کے پاس آیا ہوں۔''۔۔۔ اور پھر۔۔۔ وہ کمرے سے باہر گیا اور اردلی کے پاس

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

رکھا ہوا اپنا تھیلا لے کر واپس اندر آیا۔ اُس نے تھیلا کھولا اور اُس میں سے ایک کٹا ہوا اِنسانی سر باہر نکالا اور ایس پی صاحب کی میز پر بڑے فخر سے رکھ دیا اور بولا۔

''یہ ہے جناب ثبوت۔ اب آپ کو آ گیا یقین کہ مَیں بھی ملی ٹینٹ مار سکتا ہوں۔'' اور ایس پی صاحب اپنی میز پر کٹے ہوئے اِنسانی سر کو دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

شائینگ اِنڈیا

رات کے سناٹے میں گنگو شہر کی ویران سڑکوں پر سے گزر رہا تھا۔ دُور گلیوں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ سڑک کی دونوں پٹڑیوں پر کئی ہڈیوں کے ڈھانچے بے سُدھ پڑے تھے جن کے گوشت کو مُفلسی کے خونخوار بھیڑیوں نے نوچ ڈالا تھا۔ کئی مسلی کلیاں، کئی مُرجھائے پھول نیند کی پُر فریب وادی میں گُم، آنے والی صبح کے بارے جانے کیا کیا سپنے دیکھ رہے تھے۔ یہ خواب اور ہو بھی کیا سکتے ہیں۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے دو روٹیاں بدن ڈھانپنے کے لیے دو کپڑے اور رہنے کے لیے ایک چھوٹی سے کُٹیا۔ یہی سپنے تو دیکھتے دیکھتے غریب معصومیت سے لے کر جوانی اور بوڑھاپے کی منزلیں طے کرتا ہے اور چراغ بجھنے تک جانے ریت کے کتنے محل بناتا ہے لیکن ریت کے یہ محل کب تک ٹھہر سکتے ہیں۔ جب یہ ڈھے جاتے ہیں تو انہیں کفن کے لیے دو گز کپڑا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اِن کی لاشیں بے گور و کفن سڑتی رہتی ہیں۔

وہ سوچ رہا تھا، پتھر کے بستر پر مُفلس کو کس مزے سے نیند آتی ہے۔ ایسی نیند تو شاید سوشلزم کے علمبرداروں کو ائیر کنڈیشن کمروں میں بچھے نرم بستروں پر بھی نہیں آتی ہوگی۔ گنگو اپنے خیالوں میں ڈوبا اندھیری سڑک پر سے گزر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کتنی ترقی کی ہے آج کی دُنیا نے۔ یہ بڑی بڑی فیکٹریاں، کھاد کی، کپڑوں کی، بڑی بڑی مشینوں کی۔ یہ چمنیوں سے اُٹھتا ہوا سیاہ دھواں اور اِن کے اندر کام کرتا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہوا افلاس۔ یہ بڑے بڑے ڈیم ترقی کے ضامن۔ اسلحہ ساز کارخانے۔ یہ مُلک کا بچاؤ سامان۔ ایٹم بم۔ اِس سائنسی دور نے کتنی ترقی کی ہے لیکن سب سے زیادہ ترقی تو مُفلسی میں ہوئی ہے۔ آج دُنیا کی آبادی کا بیشتر حصہ پتھر کے زمانے سے بھی ابتر حالت میں دِن گزار رہا ہے۔ دُنیا کے بیشتر حصے پر اِسی منحوس لفظ کا سایہ ہے اور اِسی منحوس لفظ کو اپنی پیشانی سے ہمیشہ کے لیے مٹانے کے لیے ہی گنگو اِس اندھیری رات میں گھر سے نکلا تھا۔

گنگو ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا لیکن اِس ترقی یافتہ دُنیا میں قابلیت کی کوئی قدر نہیں۔ اچھی ملازمت کے لیے اُس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن اُس کے پاس نہ کوئی سفارش تھی اور نہ رشوت۔ تھک ہار کر وہ کلرک بھرتی ہو گیا۔ ماں نے اپنے زیور بیچ کر اور لوگوں کے کپڑے سی سی کر بیٹے کو جس چاؤ سے پڑھایا تھا اُس کا پھل آٹھ ہزار روپے ماہوار ملنے لگا۔ شادی ہوئی اور دو سال میں دو بچے بھی ہو گئے۔ کم بخت غریب کی ہر تفریح اُس کی بیوی ہوتی ہے۔ مُفلسی گنگو کے چہرے پر اپنے گہرے نشان چھوڑنے لگی۔ وہ بھی تنخواہ بڑھانے کے لیے ملازموں کی ایجیٹیشن میں شامل ہو گیا اور بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے جُرم میں نوکری سے ڈسمس کر دیا گیا۔ وہ پھر در در کی ٹھوکریں کھانے لگا۔ کتنے ہی دِنوں اُس کے گھر میں چولہا نہیں جلا تھا۔ بچے بھوک سے بِلک رہے تھے۔ بیوی نڈھال تھی۔ گنگو سے یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اپنی چھوٹی سی دُنیا کو اُجڑنے نہیں دے گا۔ وہ اُن کو بھوک سے مرنے نہیں دے گا۔ وہ اِسی فولادی عزم کے ساتھ گھر سے نکلا تھا۔

گنگو نے اپنے قدم صدر بازار کی طرف موڑ لیے۔ وہ بازار کا اچھی طرح سے جائزہ لینے لگا۔ سارے علاقے پر موت کی سی خاموشی تھی۔ وہ ایک ایک دوکان کا سائن

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بورڈ پڑھ رہا تھا۔ ''شرما ٹیلرز''، ''تاج محل اینڈ کمپنی''، ''میٹھی کلاتھ ملز''، ''دلیپ پان ہاؤس''، ''ایسٹرن گلاس ہاؤس'' اور وہ رُک گیا۔ اپنے عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے۔ اُس نے دوکان کا بھرپور جائزہ لیا۔ یہ شیشوں اور خوبصورت تصویروں کی دوکان ایک بہت بڑے آہنی دروازے سے بند تھی۔ شیشہ اور لوہا۔ وہ زیرِ لب مُسکرایا اور بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ تالے توڑ کر دوکان کے اندر داخل ہو گیا۔ اُس نے بجلی کا سُوچ آن کیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ ساری دوکان تصویروں سے بھری پڑی تھی۔ دیواروں پر آویزاں فریموں کے اندر سے یہ تصویریں گنگو کو جھانک رہی تھیں۔ گنگو جو ایک آدرش نوجوان تھا۔ جس نے ہمیشہ حق اور صداقت کا سبق سیکھا تھا۔ وہی گنگو آج بدی کے راستے پر چل کر اپنی تقدیر بدلنا چاہتا تھا۔ وہ سماج کے بنائے ہوئے اصولوں سے بغاوت کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ بدلا لینا چاہتا تھا اُس کھوکھلے سماج سے جس نے چھوٹے بڑے اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفریق ڈالی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بُرائی ماں کے پیٹ سے نہیں نکلتی، اِسے سماج ہی جنم دیتا ہے۔ اِس کے کھوکھلے اصول اِنسان کے ذہن میں بُرائی کے بیج بوتے ہیں اور یہی بیج گنگو کے دماغ میں جڑ پکڑ چکے تھے۔

وہ دیواروں پر آویزاں تصویروں کو گھورنے لگا۔ وہ برابر دیکھے جا رہا تھا، ترتیب سے لگی تصویروں کو۔ یہ ایک طرف قطار میں لگی تصویریں مندر، مسجد، گوردوارہ اور کلیسا کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ جنہوں نے ہمیشہ اِنسانیت کے عظیم پرچم کو سربُلند کیا اور جن کو غریب جنون کی حد تک پیار کرتا ہے اور کبھی کبھی اِسی جنون میں اِنسانیت کو پاؤں تلے روند ڈالتا ہے اور یہ ساتھ ہی تُلسی، کبیر، ٹیگور، اقبال سچائی کے مفکّر، گاندھی، جواہر، آزاد، بہادر امن کے پُجاری اور یہ کنگ لوتھر، لینن، مارکس، ماؤ، جن کے پُجاری اِس زنگ آلود سماج کو بدل دینا چاہتے ہیں، افلاس کے کینسر کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

چاہتے ہیں کیوں کہ غرُبت وہ زہریلا کیڑا ہے جو اِنسانی جسم کو کھوکھلا بنا دیتا ہے۔ اِسی لیے یہ لوگ اپنا حق چھین کر لینا چاہتے ہیں۔ گنگو دیوار کی دوسری طرف لگی تصویروں کو دیکھنے لگا۔ یہ ہنستے کھلتے چہرے۔ یہ راحت وشادابی سے پُر چہرے۔ یہ عیش وعشرت میں گُم زندگی۔ گنگو سوچنے لگا۔ کبھی اُس کا چہرا بھی سُرخ تھا۔ کبھی اُس کی بیوی بھی ہنستا پھول تھی لیکن غریب کے آنگن میں کھلے پھولوں کی عُمر دو دِن بھی نہیں ہوتی۔ اُس پر تو سدا خزاں کا سایہ رہتا ہے لیکن اب وہ اِس خزاں کو ہمیشہ کے لیے ایک گہری قبر میں دفن کر دے گا۔ وہ پھر بہار لائے گا۔ اُس کا مُرجھایا چہرا پھر کِھل اُٹھے گا۔ اُس کی بیوی کا روپ پھر نِکھرے گا۔ اِن تصویروں کے نیچے لکشمی دیوی پھولوں کی مالا پہنے مُسکرا رہی تھی۔ اُس کے پہلو میں سیٹھ گوبند داس جِس کی رگوں میں غریب کے ناتواں جسم سے نچوڑا ہوا خون صاف دوڑتا دِکھائی دے رہا تھا اور سیٹھ کے بالکل نیچے اُس کی فولادی سیف جسے گنگو کا فولادی عزم توڑنا چاہتا تھا۔ اُس کی نظریں کبھی فن اور صداقت کے عظیم محافظوں کی طرف اُٹھیں، جِن کے ارشادات آج کی دُنیا کے لیے بھولے بِسرے افسانے بن چکے ہیں اور کبھی عشرت کے دِلفریب ستاروں کی طرف جِن کو چھونے کے لیے غریب کا دِل بھی چاہتا ہے۔ وہ کبھی دیوار کی ایک سمت دیکھتا اور کبھی دوسری جانب۔ سچائی بدی سے روکتی اور بھوک اور ننگ بدی پر اُکساتی۔ اُسے مفکّر سچ کا درس دینے لگے اور راحت کے سُنہرے خواب اُس کے ہاتھوں کو تجوری کی جانب لے جانے لگے۔ وہ کبھی اِدھر دیکھتا اور کبھی اُدھر۔ اُس کے دماغ میں ایک ہیجان برپا ہونے لگا۔ اُس کا دِل و دماغ مُنتشر ہونے لگا۔ اُس کے ذہن میں یہ الفاظ بار بار گونجنے لگے۔

''اپنا حق چھین کے لے لو،'' لیکن کیا اپنا حق اِس طرح لیا جاتا ہے۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اِسی طرح تو لیا جاتا ہے۔ اب اِس کے سوائے تو کوئی دوسرا راستہ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہی نہیں رہا۔۔۔ پر یہ راستہ دُرست نہیں ؟۔۔۔ کون کہتا ہے۔۔۔ یہی راستہ تو دُرست ہے۔۔۔ سرمایہ داری کی جڑوں کو کاٹنے کا۔۔۔ لیکن یہ اِنسانیت کے منافی ہے۔۔۔ پر اِنسانیت سے تو پیٹ نہیں بھرتا۔۔۔ اُس کے لیے پیسہ چاہیے۔۔۔ پیسہ۔۔۔ پیسہ۔۔۔ جو اِن تجوریوں میں بند پڑا ہے۔۔۔ توڑ دو تالے اِن تجوریوں کے۔۔۔ بانٹ دو یہ پیسہ اُس کے حقداروں میں۔۔۔ مٹا دو افلاس کے منحوس لفظ کو۔۔۔ اُس کے قدم سیف کی طرف بڑھنے لگے۔۔۔ اور۔۔۔ اور اُس کے ہاتھوں نے سیف کو پکڑ لیا اور تصویریں اُسے دیکھتی ہی رہ گئیں۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

روپ اور سائے

وہ نفرت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ کہے جا رہی تھی۔ ''یہ شہری بابو۔۔۔ ذلیل کُتے۔۔۔ بے ایمان۔۔۔ کوئی بھروسہ نہیں اِن لوگوں کا۔۔۔ دغا باز۔۔۔''

اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کی جوانی، گدلے پانی میں کھلا ہوا کمل تھی۔ جو اُس کے پھٹے ہوئے لباس سے جھانک رہی تھی۔ اُس کی عُمر 22 سال کے لگ بھگ تھی۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک خوبصورت بچہ کھیل رہا تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ دیوانی ہے۔

''تمھارا نام کیا ہے؟'' مَیں نے اُس سے پوچھا۔

''تم کون ہوتے ہو میرا نام پوچھنے والے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ اِس گاؤں میں تم جیسے ذلیل لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔''

مَیں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ جب تک کہ وہ میری نظروں سے اُوجھل ہوگئی۔

میری اِس گاؤں میں نئی نئی تقرری ہوئی تھی۔ مجھے یہاں آئے ابھی دو ہی روز ہوئے تھے۔ مَیں پورے گاؤں سے واقف ہونا چاہتا تھا چنانچہ مَیں اپنے چپراسی گوبندُو کو ساتھ لیے گاؤں کے دورے پر جایا ہی چاہتا تھا جو یہ ہنگامہ پیش آیا۔

''یہ کیا ماجرہ ہے۔'' مَیں نے گوبندُو سے پوچھا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''یہ پاگل لڑکی ہے حضور۔'' وہ بولا۔

''کسی شہری بابو نے اِس کی عزت لوٹ لی اور خود بھاگ گیا۔ یہ معصوم بچہ اُسی کا ہے۔ اِس لیے جو بھی کوئی شہری بابو اِس گاؤں میں آتا ہے یہ اُسے گالیاں دیتی ہے۔''

گوبِندُو کہے جا رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے اُس کی تصویر گھوم رہی تھی۔

''اِس کا نام راجو ہے۔ یہ بہت اچھا گاتی ہے حضور! لوگ اِس کا گانا سنتے ہیں اور کچھ پیسے دے دیتے ہیں جس سے یہ اپنا پیٹ پالتی ہے۔ اِس کا بچہ ہمیشہ اِس کے پاس رہتا ہے۔ ایک پل کے لیے بھی یہ اُسے جُدا نہیں کرتی۔''

وہ کہے جا رہا تھا اور مَیں سوچ رہا تھا کہ اِنسان کے اِس وحشی پن نے نہ جانے کتنے گھر اُجاڑ دیے ہیں۔ اِنسان بھی کیا درندہ ہے جو اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے کیسے کیسے گُناہ کرتا ہے۔ اُسے نہ مندر و مسجد سے خوف آتا ہے نہ گوردوارہ اور کلیسا سے۔ موقع ملنے پر وہ بھگوان کی بھی عزت لوٹ لیتا ہے۔

''حضور اُس کا گھر اُس سامنے والی پہاڑی پر ہے۔''

مَیں شام کو گاؤں کے دورے سے واپس لوٹا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ کھانا کھایا اور بستر میں لیٹ کر کتاب پڑھنے لگ گیا لیکن میرے دِل و دِماغ پر راجو ہی چھائی رہی۔ مَیں سوچتا رہا، کتنا درد ہے راجو کی داستان میں۔ وہ کون وحشی تھا جس نے اِس معصوم کی دُنیا برباد کر دی۔ میرے دِل میں راجو کے لیے ہمدردی پیدا ہو گئی۔

صبح گوبِندُو چائے بنا رہا تھا۔ مَیں نے اُسے پوچھا ''کیا تُم راجو کو یہاں لا سکتے ہو؟ مَیں اُس کا گانا سُننا چاہتا ہوں۔''

دوسرے ہی روز وہ راجو کو ساتھ لیے آ گیا۔

مَیں باہر دھوپ میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ گوبِندُو کہنے لگا:

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''حضور! وہ آ گئی۔''

''کون!'' مَیں نے پوچھا۔

''وہی حضور! راجو!''

''حضور! مَیں اُسے سمجھا بُجھا کر لایا ہوں۔ وہ اب گالیاں نہیں دے گی۔ مَیں نے آپ کے بارے میں اُسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اتنے میں وہ اپنے خوبصورت بچے کو اُنگلی لگائے میرے سامنے آئی اور مجھے نمستے کی۔ مَیں نے اُس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ مجھے لگا جیسے وہ خوب رو کر آئی ہے۔ مَیں نے اُسے بیٹھ جانے کو کہا۔ وہ بیٹھ گئی۔ مَیں نے اُس کے بچے کو گود میں لے لیا۔ وہ بہت ہی خوبصورت بچہ تھا۔ گورا رنگ۔ سُنہرے بال۔ مَیں نے اُس ننھے پھول سے پوچھا:

''بیٹا! تمہارا نام کیا ہے۔''

وہ آہستہ سے بولا ''منگو۔''

اُس کی عُمر کوئی 3 سال ہوگی۔

''راجو کوئی اچھا سا گانا گاوَ۔'' گوبِندُ و بولا۔

اور وہ گانے لگی۔ وہ سُہاگ کا گیت گا رہی تھی۔ اُس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے گاتی رہی۔ مَیں اُسے دیکھتا رہا۔ کتنی مٹھاس تھی اُس کے گلے میں۔ گاتے گاتے اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ شاید اُسے اُس پاپی کی یاد آ رہی تھی جس نے اُس کی عزت لوٹی تھی۔ گانا ختم ہوا۔ مَیں نے کہا:

''راجو تُم بہت اچھا گاتی ہو۔ تمہارے گانے میں درد ہے۔ کسک ہے۔'' وہ کچھ نہ بولی۔ مَیں نے جیب سے سو روپیہ کا نوٹ نکالا اور اُسے دے دیا۔ وہ بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی:

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''اُس نے بھی مجھے سو کا نوٹ دیا تھا۔''

''کِس نے؟'' مَیں نے پوچھا۔

''بابو نے۔''

وہ اُٹھی۔ بچے کو میری گود سے چھینا اور چلی گئی اور مَیں سوچتا رہ گیا۔

''کیا اِس خوبصورت لڑکی کی قیمت صرف سو روپے ہے؟ کیا اِنسان کی عزت اتنے سستے داموں فروخت ہوتی ہے؟ کیا یہ حوا کی بیٹی نہیں؟ کیا یہ سیتا کی بیٹی نہیں؟ پھر کیوں عورت کی عصمت سے کھیلا جاتا ہے؟ کیوں عورت کو رسوا کیا جاتا ہے؟''

اب وہ اکثر میرے پاس آتی۔ وہ پاگل نہ تھی۔ وہ اچھی طرح بولتی تھی۔ منگو روزانہ میرے ساتھ کھیلتا۔ مجھے اُس معصوم بچے سے پیار ہو گیا تھا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں میرے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرتا۔

راجو کو شہری لوگوں سے نفرت تھی۔ شہری لباس سے نفرت تھی۔ وہ کبھی کبھی کہتی:

''بابو جی! آپ لوگوں کے کپڑے اُجلے ہوتے ہیں لیکن من کالا ہوتا ہے۔''

اور مَیں ہنس دیتا۔

دیوالی آنے والی تھی۔ مَیں چاہتا تھا کہ دیوالی اپنے گھر جا کر مناؤں لیکن گوبِند وزور دے رہا تھا کہ اب کی دیوالی مَیں یہاں ہی مناؤں۔ اِسی کشمکش میں دیوالی کا دِن آ گیا۔

راجو میرے پاس آئی۔ مَیں نے منگو کو گود میں اُٹھا لیا۔ اُسے پیار کیا۔ مٹھائی کھلائی۔ مَیں نے ایک جوڑا کپڑوں کا راجو کو اور دو تین کپڑے منگو کو دیے۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ وہ کہنے لگی:

''حضور آپ بہت اچھے ہیں لیکن سبھی لوگ اچھے نہیں ہوتے۔ کیوں نہیں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہوتے بابو جی؟''

''راجو تُم بہت بھولی ہو۔ یہ پُر فریب دُنیا ہے۔ یہاں قدم قدم پر دھوکے ہیں۔ یہاں ہوس اور لالچ کا راج ہے۔ شرافت کوسوں دور ہے اِس دُنیا سے لیکن راجو وقت آنے والا ہے جب یہ ہوس اور لالچ کے ستون مسمار ہو جائیں گے۔ اِنسان وحشی نہ ہوگا۔ کوئی کسی کی عزت پر ڈاکہ نہ ڈالے گا۔ چند سِکوں کی خاطر عورت کی عصمت نیلام نہ ہوگی۔ بھوک و افلاس سے بچے تڑپیں گے نہیں۔ اِنسان کائنات کی بہترین مخلوق ہوگا۔''

مَیں کہے جا رہا تھا۔ مَیں نے دیکھا۔ راجو کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ بھرائی آواز میں بولی:

''حضور آج ہی کا دِن تھا جب اُس نے میرا فوٹو اُتارا تھا۔ آج ہی کے دِن وہ درندہ میری عزت سے کھیلا تھا۔''

''راجو تُم مجھے اپنی پوری کہانی سُناؤ۔ اپنے دِل کو ہلکا کرو۔''

''بابو جی! اِس دُکھیاری کی کہانی سُن کر کیا کیجیے گا۔'' میرے بار بار اصرار کرنے پر اُس نے اپنا قِصّہ سُنانا شروع کیا۔

''بابو جی! مَیں اور میرا باپو اُس پہاڑی والے مکان میں رہتے تھے۔ تھوڑی سی زمین ہے جس پر کاشت کر کے ہم اپنا پیٹ پالتے تھے۔ میرا باپو اکثر بیمار رہتا تھا۔ ایک دِن وہ بہت بیمار ہوا۔ دیوالی کا ہی دِن تھا اور مَیں بن سنور کر گاؤں کا میلہ دیکھنے گئی تھی۔ گھر پہنچی تو دیکھا، باپو کو کھانسی کے ساتھ خون آ رہا تھا۔ مَیں گھبرائی ہوئی باہر کو دوڑی۔ میرے پاس پیسے نہ تھے۔ پھر بھی میرے قدم وید جی کے گھر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ راستے میں ایک شہری بابو مجھے ملا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کیمرا تھا۔ میری گھبراہٹ کو دیکھ کر وہ بولا:

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''کیا بات ہے؟''

مَیں نے باپو کی بیماری کا سارا قصہ سُنایا۔ وہ بولا:

''گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اُس نے مجھے کہا کہ اگر مَیں اُسے اپنے دو فوٹو کھینچنے دوں تو وہ مجھے سو روپے دے گا۔ مَیں مان گئی۔ اُس نے مجھے سو کا نوٹ دیا اور میرے تین چار فوٹو اُتارے۔ مَیں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور دور جانا ہی چاہتی تھی کہ اُس نے میری کلائی پکڑ لی اور بولا ''ابھی کیسے جا سکتی ہو، ابھی پوری قیمت تو چُکاتی جاؤ۔'' مَیں ڈر گئی۔ اُس نے میری کلائی مظبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ مَیں نے کلائی چھڑانے کی لاکھ کوشش کی لیکن بے سود۔ مَیں چلّائی۔ بچاؤ، بچاؤ، لیکن اُس جنگل بیابان میں میری آواز درختوں سے ٹکرا کر ختم ہوگئی۔ سب دیوی دیوتا گہری نیند سو رہے تھے۔ کوئی بچانے والا نہ ملا۔ اُس نے مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ مَیں تڑپی لیکن ایک بے بس عورت کیا کر سکتی تھی۔ اُس ذلیل کُتے نے اپنی ہوس پوری کی۔ مَیں بے ہوش ہوگئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو خوب روئی۔ گھر پہنچی تو میرا باپو مر چُکا تھا۔ مجھ پر ایک اور صدمہ ٹوٹا اور پھر مَیں صدمے پر صدمے برداشت کرنے کی عادی ہوگئی۔''

یہ دِل دہلا دینے والی روداد سُن کر مجھے مرد ذات سے نفرت ہونے لگی۔ اُس کے وحشی پن سے نفرت ہونے لگی۔ مَیں راجو کے بارے میں کئی دِن متواتر سوچتا رہا۔ اُس کے بچے کے بارے میں سوچتا رہا، اُن کی آنے والی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ دِن گزرتے گئے۔ مَیں راجو کے بارے میں سنجیدہ ہونے لگا۔

اور پھر ایک دِن میری شادی کی خبر چاروں اطراف پھیل گئی۔ پورا گاؤں خوش تھا ایک جشن کا سا ماحول تھا۔ سبھی میرے جذبے کی داد دے رہے تھے کیوں کہ مَیں نے اُسے اپنا لیا تھا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

لقے کبوتروں کا انت

وہ لال پری۔۔۔ اکیلی۔۔۔ چوراہے پر کھڑی گاہک ڈھونڈتی رہتی ہے۔ اُس نے سر پر کالا سکارف باندھا ہوا ہے اور کمر پر پیلی دھاریوں والی چادر اوڑھی ہوئی ہے جس پر لکھا ہوا ہے کہ یہاں کوئی بھی شخص، کسی بھی وقت لال پری کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کر سکتا ہے۔ دِن بھر طرح طرح کے نمونے اُس کے پاس آتے ہیں اور اپنے ہاتھوں میں پکڑے رنگ برنگے کبوتر اُس کے پیٹ میں ڈال کر چلے جاتے ہیں۔

پھر دِن چڑھے اور شام ڈھلے ایک شاہ مار آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اُس کے پاس آتا ہے اور اُس کے نچلے دھڑ کو چیر کر سارے کبوتر نِگل جاتا ہے اور اُس کے پیٹ کو اپنی زبان سے چاٹ کر چلا جاتا ہے۔ وہ لال پری چُپ چاپ دیکھتی رہتی ہے۔ منہ سے کُچھ نہیں بولتی لیکن اُس کی آنکھیں کہتی ہیں:

''میرا آپریشن کر کے میرا لِنگ نہ بدلو۔ مجھے سُہاگن رہنے دو کیوں کہ سُہاگن ہونا ایک عورت کی پہچان ہے۔ پر لال پری کو کون سمجھائے کہ کمپیوٹر یُگ میں شبدوں کے ارتھ ہی بدل چکے ہیں۔ پُرانی چیزوں کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ آج جسمانی تعلقات کی بجائے مصنوعی طریقوں سے حمل کرایا جاتا ہے تو پھر جسمانی رشتوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کوئی رشتے بنانے کے لیے منت سماجت کیوں کرے۔ آج کے اِس ٹیکنالوجی کے دور میں موبائل، ای میل اور ویب سائٹ ہمارے سُرخے، چِینے، لقے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اور جون سرے کبوتر ہیں، پھر ہم بے پرواز کبوتروں کو کیوں چوگ ڈالتے رہیں۔ ہم نئے دور کے غازی ہیں۔ ہم لال پری کے ساتھ کسی قسم کا سمبندھ نہیں رکھنا چاہتے کیوں کہ ہم سرشٹی کو آنکھ کے پلکارے میں فتح کر سکتے ہیں۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہاتھی اڑھائی لاکھ کا

کہتے ہیں کہ زندہ ہاتھی لاکھ کا اور مرا ہوا سوا لاکھ کا ہوتا ہے لیکن جس ہاتھی کی آپ بیتی مَیں آپ کو سُنانے جا رہا ہوں، وہ ہمارے کسی سیاسی لیڈر کی طرح سفید نسل کا ہاتھی نہیں ہے جو اپنے ذاتی مفادات کے لیے لوٹ مار مچانے اور قوم کا بیڑا غرق کرنے کے باوجود بھی بڑا مہنگا بکتا ہے۔ ہماری داستان کا ہیرو ایک سیدھا سادا یعنی سادھارن قسم کا ہاتھی ہے جس کا رنگ کالا مٹیالا، پنکھے جیسے کان، ایک موٹی سُونڈ، ایک پُونچھ، چار موٹی موٹی ٹانگیں، دو چھوٹی آنکھیں، کچھ دانت کھانے کے اور دو دانت دِکھانے کے یعنی بالکل اصلی اور خاص دراوڑی نسل کا ہاتھی۔ اس ہاتھی نے جنوبی ہند کے جنگلوں میں جنم لیا۔ اِس کے ماں باپ، دادے پڑدادے اور لکڑ دادے سبھی جنوبی ہند کے جنگلوں میں ہی پیدا ہوئے اور اِنہیں جنگلوں میں گھاس، پتے، جڑی بوٹیاں اور پھل کھا کر جوان ہوئے اور آزادی کے ساتھ زندگی گزار کر اِس جہاں فانی سے چلے گئے۔ اِس ہاتھی کا ذرا سا ماضی بتانے کا مطلب قارئین کو بڑی عاجزی کے ساتھ یہ جانکاری دینا ہے کہ یہ ہاتھی شُدھ بھارتی ہے۔ افریقہ، امریکہ، چین یا جاپان سے نہیں آیا۔ یہ کسی اور مُلک کا بھی گھس پیٹھیا نہیں ہے۔ یہ نرول بھارتی ہے اور بھارتی سنسکرتی میں ہی پروان چڑھا ہے۔ بھارت ماتا کے سُپر مینوں اور بھارت کی اکھنڈتا کے رکھوالوں سے گذارش ہے کہ وہ اِس ہاتھی کے بھارتی ہونے پر ذرا بھی شک نہ کریں۔ اِس کے پریوار کا اندراج جنگل

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کے بندوبستی ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ آزادی کے بعد جنگلی جانوروں کی ووٹرلسٹوں میں اِس کے والدین کا نام درج چلا آرہا ہے لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے جنگل میں جمہوری نظام چلانے کے لیے اور اپنی پسند کی حکومت چننے کے لیے اِس کو کبھی ووٹ ڈالنے کا موقع فراہم نہیں کیا گیا کیوں کہ چھوٹی عمر میں ہی یہ معصوم اِنسانوں کے شیطانی جال میں پھنس گیا اور اِن کے دِکھائے ہوئے سبز باغ میں چارا چرنے لگا۔ اِس سبز باغ کا نام تھا ''بنجارا سرکس''۔ باہر سے دیکھنے میں وہ ایک چمک دمک والی سرکس تھی لیکن اندر سے ایک طبیلہ، جس پر واٹر پروف ترپال کا ایک بڑا تنبو لگا ہوا تھا۔ طبیلے میں اِس ہاتھی کے علاوہ دو ریچھ، تین لنگور، چار بندر، چانچ طوطے، چھ کبوتر، ایک شُتر مُرغ، ایک شیرنی، دو شیر، کچھ بطخیں اور اپنے مستقبل سے مایوس چند فنکار اکٹھے دانا پانی چرتے تھے اور پربُھو کے گُن گاتے تھے۔ اِس طبیلے میں رہنے والے سبھی کلاکاروں کی خواہش کے کچے برتن اکثر ٹوٹتے رہتے تھے کیوں کہ پیوند لگے تنبو میں کچے برتنوں کا ٹوٹنا اُن سب کا مقدر تھا۔ ہمارا ہاتھی بھی بنجارا سرکس کے سبز باغ میں قید ہو کر گھر سے بے گھر ہو گیا اور شہروں کی رنگ برنگی اور کلچرڈ زندگی میں دربدر پھرنے لگا۔ اِس سرکس کے مالک قادر یار نے ہاتھی کا نام راجو رکھا تھا۔ راجو مہاوت کے سِکھائے گئے کرتب دِکھا کر لوگوں کی دلچسپی کا سامان بن گیا اور قادر یار کے لیے کمائی کا وسیلہ۔

ہمارے ہاتھی کی دُکھی داستان تب شروع ہوئی جب قادر یار کی سرکس نے جموں کے نزدیک اور پاکستانی سرحد کے بالکل سامنے موضع ارنیہ میں اپنا ڈیرہ جمایا۔ ہوا یوں کہ ایک دِن کڑکتی دوپہر کے وقت راجو اپنے مہاوت کی ہدایت کاری میں کھیتوں میں سبز چارہ کھا رہا تھا۔ اور جنگل راج میں پھیلی بُرائیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ گاؤں کے کچھ نٹ کھٹ بالک اُسے تنگ کرنے لگے۔ راجو کو سخت غصہ آیا۔ اُسے شاید

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

زندگی میں پہلی بار غصہ آیا تھا ورنہ وہ بیچارہ ہمیشہ کام، کرودھ اور موہ مایا سے پرہیز کرتا تھا۔ غصے کو پی جانے کے لیے وہ دوڑنے لگا۔ وہ دوڑتا رہا۔ مہاوت اُس کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا۔ اُس نے ہاتھی کو روکنے کی بہت کوشش کی۔ اُسے سمجھایا کہ آگے نہ جا۔ آگے پاکستان کی پاک سرزمین ہے۔ وہاں جانے سے سرحد کی خلاف ورزی ہوگی اور سرحد کی خلاف ورزی پر تُو پکڑا جائے گا۔ تجھے کوڑے کھانے پڑیں گے لیکن ہاتھی بیچارا ملکی سرحدوں اور اُس کی خلاف ورزیوں کو کیا سمجھتا۔ وہ غصے میں اپنے سائے سمیت پاکستانی سرحد عبور کر گیا۔ راجو پاکستانی سرحد کے اندر دوڑتا جا رہا تھا اور مہاوت اُسے اپنی سرحد پر کھڑا بڑی یتیمی کے ساتھ آنکھ سے اوجھل ہوتا دیکھ رہا تھا لیکن مہاوت نے ہاتھی کو اپنے دِل سے اوجھل نہیں کیا اور فوراً بنجارا سرکس کے سنچالک قادر یار کو بیتی داستان سُنا ڈالی اور راجو کو واپس بھارت ماتا کی گود میں لانے کی سبیل ڈھونڈنے کا مشورہ دیا۔ قادر یار گھبراہٹ میں سرپٹ دوڑتا ہوا سرحدی حفاظتی پولیس کے چوکی افسر کے پاس گیا اور چھاتی پیٹتے اور بین کرتے ہوئے کہنے لگا:

''انسپکٹر صاحب! دُہائی ہے دُہائی! میری مدد کریں ورنہ مَیں برباد ہو جاؤں گا۔ میرے کلاکار بھُوکے مر جائیں گے حضور! کچھ کریں اور راجو کو واپس لائیں۔''

''تمہارے ہاتھی نے سرحد پار کیوں کی؟ وہ پاکستان میں کیا لینے چلا گیا۔ ڈیفنس آف اِنڈیا اور پاکستانی سرحدی قانون کے مطابق اُس نے سنگین جرم کیا ہے۔ جس میں اُسے سات سال تک کی سزا ہو سکتی ہے۔''

''انسپکٹر صاحب! آپ پہلے اُسے واپس لانے کی کوئی ترکیب ڈھونڈیں۔ پھر چاہے جتنی مرضی سزا دیں۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟ تمہارے ہاتھی کا نام کیا ہے؟ آپ دونوں کہاں کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

رہنے والے ہو اور کیا کام کرتے ہو؟''

''سرکار میرا نام قادر یار ہے اور میرے ہاتھی کا نام راجو ہے یعنی راج محمد۔ مَیں بنجارا سرکس کا مالک ہوں اور راجو میری سرکس کا سب سے مہنگا اور بہترین کلاکار ہے۔ یہ لوگوں کو اپنے کرتب دِکھاتا ہے۔ راجو اور کچھ دوسرے حیوانی اور اِنسانی کلاکاروں کی بدولت ہی میری سرکس چلتی ہے۔ اور چلتی سرکس کی وجہ سے ہم سب کا روٹی کپڑے کا مسئلہ حل ہوتا ہے۔ ہم دونوں شُدھ بھارتی ہیں۔ اُگروادی ہرگز نہیں ہیں۔''

''قادر یار کا نام سُن کر مجھے پورن بھگت کا قصہ یاد آ گیا۔ کیا خوب شعر کہے ہیں قادر یار نے۔۔۔''

''حضور! کیا آپ شاعری بھی کرتے ہیں؟'' قادر یار نے پوچھا۔

''بالکل نہیں'' چوکی افسر نے کہا، پھر پوچھنے لگا۔

''اچھا تم یہ بتاؤ کہ تمہارے ہاتھی کا نام راج محمد کیسے ہوسکتا ہے؟''

''جناب! اُسی طرح، جس طرح میرا نام قادر یار ہوسکتا ہے۔ مَیں نے جیون بخش کے گھر جنم لیا اور قادر یار بن گیا۔ راجو کو مَیں جنوبی ہند کے جنگلوں سے پکڑ کر لایا تھا اِس لیے وہ راج محمد بن گیا۔ اگر مَیں کسی آتمارام کے گھر پیدا ہوتا تو میرا نام کیدار ناتھ ہوتا اور ہاتھی کا نام راج ناتھ۔ ہے نا ٹھیک بات۔''

''ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کہ راج محمد پاکستانی جاسوس تو نہیں ہے؟''

''بادشاہ سلامت! آپ کیا فرما رہے ہیں۔؟ ہاتھی جاسوس کیسے ہوسکتا ہے۔ بھلا اِنسانوں کے ہوتے ہوئے جانوروں کو کیا پڑی ہے کہ وہ جاسوسی کریں۔ دیش کو بیچنے کا کام تو قومی بگلے بھگتوں نے اپنے ذمے لیا ہوا ہے۔''

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ ہم راجو کو ہر حالت میں واپس لانے کی کوشش کریں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ انسپکٹر نے اچھی طرح سے پوچھ تاچھ کرنے اور تسلی ہو جانے کے بعد کہا۔'' اُس نے اپنا وائرلیس سیٹ کھولا اور پاکستانی سرحدی چوکی کے اپنے ہم منصب سے رابطہ قائم کیا۔

''ہیلو! ہیلو! آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟''

''مَیں پاک رینجرز کا صوبیدار میجر گُل زماں خان بول رہا ہوں۔ آپ کون صاحب ہیں؟''

''مَیں آپ کا ہمسایہ اور ماں جایا، بالکل سامنے والی بھارتی سرحدی چوکی کا انچارج انسپکٹر بلا کی شاہ بول رہا ہوں۔''

''لالہ جی نمستے۔''

''نمستے جی نمستے! ہماری بھی محبتوں والا سلام قبول کریں۔''

''ہاں تو بتائیں کیا حکم ہے؟ دھمکیوں، جوابی دھمکیوں اور جنگی بُخار کے ماحول میں آپ نے ہمیں کیسے یاد کیا۔''

''خان صاحب! ہمارے ایک غریب شہری کی تکلیف دور فرمائیں۔''

''پر لالہ جی، مَیں کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں ہوں۔ پھر مَیں کیسے۔۔۔''

''خان جی! بات یوں ہے کہ ہمارے ایک مسکین شہری قادر یار کی سرکس کا ہاتھی غلطی سے سرحد پار کر کے آپ کی طرف چلا گیا ہے۔ اُس پاگل کو سرحد کی خلاف ورزی کرنے یا نہ کرنے کی کوئی سمجھ نہیں ہے۔ بالکل چرندوں، پرندوں، دریا، ندی نالوں کی طرح، حیوانوں اور جانوروں کی طرح۔ جس طرح ہم ہندوستانی اور پاکستانی گائے بھینس ایک دوسرے کو خیر سگالی کے ناطے واپس کر دیتے ہیں بالکل اُسی طرح

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

پرانے دوستانہ جذبے کے صدقے، ہاتھی کو تلاش کر کے ہمارے حوالے کر دیں۔ بڑا کرم ہوگا، نوازش اور مہربانی ہوگی۔''

''اچھا تو یہ تکلیف ہے آپ کے شہری کو لیکن سخت حفاظتی انتظامات کے ہوتے ہوئے آپ کا پاتھی سرحد پار کیسے کر سکتا ہے۔ سرحد تو آج کل صرف مجاہد اور آپ کی زبان میں دہشت گرد یا اُگروادی ہی آر پار کرتے ہیں اور اب تو یہ کرما والی سرحد لیڈروں کی دھمکیوں کے مطابق آر پار کی نرنائک لڑائی کا انتظار کر رہی ہے تا کہ سرحد کے دونوں اطراف رہنے والی بدنصیب مخلوق ایک بار پھر خون اُگلے اور تباہ ہو۔ خیر چھوڑیے اِن فضول باتوں کو۔ آپ کی طرف سے کوئی ہاتھی ہمارے علاقے میں نہیں آیا ہے۔ آپ کے سپاہیوں کی طرح ہمارے سپاہی بھی بڑی چوکسی سے سرحد کی نگرانی کر رہے ہیں۔''

''قادر یار! پاکستانی چوکی افسر کا کہنا ہے کہ ہاتھی اُن کی طرف نہیں گیا ہے۔ اِس لیے تم یہاں سرکنڈوں کے پیچھے یا جھاڑیوں میں ڈھونڈو۔''

''میری سرکار! کیا بات کرتے ہیں آپ۔ وہ پاکستانی علاقے میں ہی گیا ہے۔ مَیں نے خود اپنی آنکھوں سے اُسے سرحد عبور کرتے دیکھا ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں۔ آپ پاکستانی افسر پر اپنا ذاتی اثر ورسوخ استعمال کریں۔ مَیں اُسے چائے پانی پلانے کے لیے بھی تیار ہوں لیکن آپ کو اپنے پرماتما کا واسطہ ہے، میرے خدا کا واسطہ ہے، میرا ہاتھی مجھے واپس دلا دیں۔''

''ہیلو! ہیلو! خان صاحب! ہاتھی آپ کی طرف ہی گیا ہے۔ ہمارے پاس پکا ثبوت ہے۔ آپ مہربانی فرمائیں اور اپنے جوانوں کو حکم دیں کہ وہ ہاتھی کو ڈھونڈ کر پکڑ لائیں، اِس ہاتھی کا مالک بڑا غریب ہے۔ پیدائشی یتیم ہے۔ ویسے بھی آپ کا ہم مذہب

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بھائی ہے۔ کردیں اِس پر نظرِ عنایت۔ آپ کو اپنے اللہ کی قسم ہے۔'' وائرلیس پر بات کرنے کے بعد بلا کی شاہ قادر یار کو دلاسہ دینے لگا لیکن قادر یار مایوسی اور حسرت سے سرحد کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔ ایک لمبے انتظار کے بعد پاکستانی رینجرز کے جوان ہاتھی کو بیڑیوں میں جکڑ کر سرحد کے قریب لائے اور اُسے شیشم کے ایک مضبوط درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ دور سے ہاتھی کو دیکھ کر قادر یار بہت خوش ہوا اور دوڑا دوڑا اپنے چوکی افسر بلا کی شاہ کو بلانے چلا گیا۔ بلا کی شاہ نے وائرلیس سیٹ پر پاکستانی رینجرز کے افسر گُل زمان خان سے پھر رابطہ قائم کیا۔

''بلا کی شاہ جی! آپ کا ہاتھی تو مل گیا ہے لیکن یہ آپ کو تب ملے گا جب آپ سوا لاکھ کی رقم ہمارے حوالے کردو گے تاکہ یہ رقم ہم سرکاری خزانہ میں جمع کروا سکیں۔''

''خان صاحب سوا لاکھ روپے کس بات کے۔ یہ تو اندھیر گردی ہے؟''

''لالہ جی! بات ڈھنگ سے کریں۔ آپ کے ہاتھی نے ہمارے گاؤں کی سکولی عمارت توڑ دی ہے اور ہمارے انجنیئر نے نقصان کا تخمینہ سوا لاکھ روپے لگایا ہے۔ چار کمروں پر مشتمل پکی بلڈنگ تقریباً کھنڈر بن چکی ہے۔''

''خان صاحب! یہ غریب شخص اتنی بڑی رقم کہاں سے لائے گا۔ آپ ذرا فراخدلی سے کام لیں اور کچھ لے دے کر فیصلہ کردیں۔ قادر یار پانچ ہزار روپے تک دینے کو تیار ہے۔ کہیے کیا خیال ہے۔ کرلوں بات پکی؟''

''نہیں نہیں لالہ جی ایسی بات نہ کریں۔ سرحد پر لگی اِن خاردار تاروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ آج کل یہ باتیں ہمیں راس نہیں آتیں۔ آپ کا ارادہ ہمیں کہیں احتساب عدالت میں پھنسانے کا تو نہیں ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ آج کل سارا معاملہ فوجی بھائیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اِس لیے مَیں کچھ نہیں کرسکتا۔''

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دونوں کی باتیں سُن کر قادر یار بے ہوش ہو گیا۔ اُس کے ماتھے سے ٹھنڈا پسینہ اور منہہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ بلا کی شاہ نے اُس کے منہہ پر پانی چھڑکا۔ پنکھے سے ہوا دی۔ پاؤں کی مالش کی اور اُسے ہوش میں لانے کے لیے آدھا پورن بھگت سُنا ڈالا۔ جب قادر یار ہوش میں آیا تو بلا کی شاہ نے اُسے دِلی جانے کا مشورہ دیا۔ اور سمجھایا کہ وہ دِلّی میں وزارتِ دفاع میں جائے۔ وہاں بڑے حاکموں سے ملے تا کہ وہ اعلیٰ سطح پر پاکستانی سرکار کے ساتھ یہ معاملہ اُٹھائیں اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ہاتھی واپس لا سکیں۔

قادر یار ٹوٹ چُکا تھا۔ وہ پریشان حال اپنی سرکس میں آیا۔ اُس نے اپنے مشیروں سے صلاح مشورہ کیا۔ اور شام جہلم اکسپریس میں بیٹھ گیا، جس نے اُسے ٹھیک صبح دس بجے نئی دہلی ریلوے سٹیشن پر اُتار دیا۔ یہاں سے اُس نے تین پہیہ پکڑا اور سیدھا رکھشا منترالیہ پہنچا جہاں ایک چپراسی صاحب کو خوش کرنے کے بعد وہ متعلقہ حاکم کے پاس مع عرضی پیش ہو گیا۔ درخواست پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد سیکریٹری صاحب نے قادر یار سے اُس کی دُکھ بھری کہانی سُنی۔ پھر درخواست پر ضروری کاروائی کرنے کا حکم صادر کر کے وہ متعلقہ برانچ میں بھیج دی۔ سات دنوں تک قادر یار دفتری کاروائی میں گُم رہا۔ آٹھویں دِن وہ وزیرِ دفاع سے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس نے منتری جی کو رو رو کر اپنی آپ بیتی سُنائی۔ منتری جی کو جانے قادر یار کی بے کسی کی کون سی ادا پسند آئی کہ اُنہوں نے فائل منگوائی اور اپنی طرف سے ایک چٹھی اپنے پاکستانی ہم منصب کو لکھی اور اُنہیں تلقین کی کہ وہ بھارتی ہاتھی کو واپس کر کے اُنہیں شُکریہ کا موقع بخشیں۔ ایک مہینے کے بعد پاکستان سرکار کا جواب آیا۔ لکھا تھا:

''بھارتی ہاتھی نے ہمیں بہت پریشان کیا۔ جب آپ کے ادھیکاریوں نے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سکولی عمارت کا معاوضہ نہیں دیا تو ہاتھی کو لاہور کے چڑیا گھر میں بھیج دیا گیا۔ گرفتار شدہ بھارتی ہاتھی کی خبر جب پاکستانی اخباروں میں چھپی تو پورا لاہور شہر اُسے دیکھنے کے لیے اُمڈ پڑا اور پاکستانی مہمان نوازی کی شان رکھتے ہوئے لوگوں نے بڑے پیار سے ہاتھی کو اتنے کِنوں کھلائے کہ اُس کے اندر سردی جم گئی اور اُسے لقوہ مار گیا۔ ہاتھی کا علاج کروایا گیا۔ پاکستانی ڈاکٹروں کی مدد کے لیے آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کے دو ماہرین کو بُلایا گیا۔ بروقت علاج سے ہاتھی تو ٹھیک ہو گیا لیکن ہماری سرکار کا سوا لاکھ روپیہ ہاتھی کی بیماری پر لگ گیا۔ یوں آپ کا ہاتھی اڑھائی لاکھ کا ہو گیا۔ تفصیل اِس طرح ہے:

سکولی عمارت توڑنے کا تخمینہ۔ سوا لاکھ۔

ہاتھی کی بیماری کے علاج پر خرچہ۔ سوا لاکھ۔۔۔ کُل۔ اڑھائی لاکھ۔

لہٰذا آپ سے گذارش کی جاتی ہے کہ جلد از جلد اڑھائی لاکھ روپے کا ڈرافٹ حبیب بنک آف پاکستان کے نام بھجوا دیں اور اپنا ہاتھی لے جائیں۔ یہ پاکستانی سرکار کا آخری فیصلہ ہے اور اِس میں کسی تیسرے فریق کی ثالثی قبول نہ ہوگی۔''

خط کی نقل قادر یار کے حوالے کر دی گئی۔ خط پڑھتے ہی قادر یار کو بھی لقوہ مار گیا اور سُنا ہے کہ آج کل وہ دِلی کے کسی خیراتی ہسپتال میں اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے۔

(انشائیہ)

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

عشق نچائے تھیا تھیا

آزادی اِنسان کا پیدائشی حق ہے تو عشق کرنا اُس کا رُوحانی اور رومانی حق۔ ابلیس میاں آباد رکھیں اپنے قاضی نزاکت علی صاحب کو۔ بڑی زعفرانی طبیعت کے مالک ہیں۔ اکثر اپنے گنجے سر کی قسم کھا کر کہا کرتے ہیں کہ اُنہوں نے اپنی لائف ہسٹری میں صرف دو عدد عشق فرمائے۔ وہ بھی مجنوں کے ایصالِ ثواب کے لیے۔ ایک دیوانِ عام میں اور دوسرا دیوانِ خاص میں۔ یعنی پہلا عشق لڑکپن میں ٹرائل کے طور پر نوراں دھوبن کی بیٹی سلیٹی بیگم سے، جب کہ دوسرا عشق بناسپتی گھی کی طرح شُدھ، سُدھ بُدھ گنوانے والی مشہور ماڈل اور فلم ایکٹرس سنگیتا سے۔ ہم ٹھہرے اُن کے لنگوٹیے یار۔ خوش گوار و غم خوار، چنانچہ اُن کے ہر سُکھ دُکھ میں اُن کے رفیقِ خاص بنے رہے۔ ہماری اور اُن کی یاری کالج کے زمانے میں شروع ہوئی اور پھر پانچ سالہ پلان کے تحت ترقی کی منزلیں طے کرتی گئی۔ خُدا کا شُکر ہے کہ آج ہم یار بازی میں خود کفیل ہیں۔

اللہ قاضی جی کی عمر دراز کرے، بڑی دلنواز شخصیت ہیں۔ آنکھیں نوابی، چہرا کتابی، ناک دوآبی اور دِل شتابی، سر کی کھیتی بروقت آبیاری نہ ہونے کی وجہ سے گو بنجر رہ گئی لیکن اِس کی تہہ میں ایک زرخیز خربوزی دماغ جیسے گدڑی میں لعل چھُپا ہو اور اِس گدڑی کے لعل نے بڑے بڑے طلسمی کارنامے انجام دیے جن سے لُطف اندوز

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہونے کی سعادت ہم نے بھی حاصل کی۔

ایک بار وہ اپنے خزاں رسیدہ سر کو گُلِ گلزار یعنی پُر بہار بنانے کے لیے ہماری رفاقت میں حکیم نتھومل کی دوکان پر تشریف لے گئے۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے حکیم صاحب بھی اُسی عارضہ میں مُبتلا تھے۔ قاضی جی نے بڑی معصومیت سے اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

''قبلہ حکیم صاحب! اِس گنجے پن کا کیا علاج ہے؟'' حکیم صاحب نے قاضی جی کا ظریفانہ جائزہ لیا اور حکیمانہ جواب دیا۔

''میاں اپنے سر کو ہمارے گنجے سر سے رگڑو۔ بال خود بخود کیمیائی عمل سے اُگ آئیں گے۔''

ایک بار ہم تیتر کے شکار کو نکلے کہ راستے میں ''کالی تیتری کمادوں نکلی کہ اُڈدی نوں باج پے گئے'' یعنی قاضی جی تھوڑے رومانی ہو گئے اور ندی میں نہا رہی ایک سانولی گُل بدن کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اُس ناگن صِفت حسینہ نے شور مچا دیا۔ آناً فاناً پورا گاؤں اکٹھا ہو گیا اور دوشیزہ سے پوچھنے لگا کہ کیا ماجرہ ہوا۔ اُس دیہاتی کِلو پترا نے قاضی جی کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ اِس حرامی بدمعاش نے اُس کی عزت لوٹنے کی کوشش کی۔ قاضی نزاکت علی موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بھاگنا چاہتے تھے کہ لوگوں نے اُنہیں دبوچ لیا اور غیرت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک آدھ تھپڑ اور دو تین لاتیں وگھونسے عنایت فرمانے کے بعد قاضی جی کو پنچایت میں پیش کیا اور فرد جُرم یہ لگائی کہ نعوذ باللہ قاضی جی نے دُختر گلقند کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ لہٰذا قاضی جی کو باِتفاق رائے یہ سزا سنائی گئی کہ وہ مبلغ پانچ ہزار روپے عِزتانہ ادا کریں یعنی عزت پر ہاتھ ڈالنے کا جُرمانہ۔ بڑی مشکل سے ہم نے اپنی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سفارتی کوششوں سے تین ہزار روپے میں خلاصی کروائی اور کیوپڈ کو دو چار صلواتیں سُناتے ہوئے خُدا کا شُکر ادا کیا۔ قاضی جی پر کالج کے زمانے سے ہی پروفیسر سامری بننے کا بھوت سوار تھا۔ وہ اُن کے کارناموں اور شخصیت سے اِتنے متاثر ہوئے کہ درسی کتابوں کو چھوڑ کر کالے جادُو سے لے کر بنگالی جادو جیسے ہر موضوع پر کتابیں خریدیں اور مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ چنانچہ تین سال کی کٹھن محنت بھی اُنہیں بی۔ اے کی ڈگری نہ دلا سکی لیکن اِس دوران وہ عِلم جادُو کے جِید عالم بن گئے اور سامری کی سامراجیت کو للکارنے لگے۔

خیر چھوڑئے! ہم قاضی نزاکت علی صاحب کی پریم کتھا بیان کر رہے تھے کہ بیچ میں یہ پروفیسر سامری آ ٹپکے۔ اپنے قاضی جی کو سن پچیس میں عشق کا ایسا روگ لگا کہ عاشقی کے گھوڑے گنجے سر پر چڑھ کر دوڑنے لگے اور وہ نوراں دھوبن کی بیٹی سلیٹی بیگم پر ڈورے ڈالنے لگے لیکن ابھی عشق کی چنگاری شعلہ بھی نہ بن پائی تھی کہ ایک دِن کافی ہاؤس میں قاضی جی کو ماتھے پر پٹی بندھے گرم کافی پیتے دیکھا۔ سب دوست احباب فکر مند ہوئے اور پوچھا:

''قبلہ وکعبہ! یہ نگوڑا حادثہ کیسے پیش آیا۔'' تو بڑی بے نیازی سے جواب دیا:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو مار دیا گُل ادا کے ساتھ

''پر جناب والا! پھول کی پتّی سے تو ہیرے کا جگر کٹتے سُنا ہے۔ ماتھا پھٹتے کبھی نہیں سُنا، تو فرمانے لگے ''اماں یار! نیک بخت نے گُلدان سمیت مارا تھا اور یوں گُل کے گُلدستے سے غُل ہوا چراغِ عِشق۔''

قاضی جی کا دوسرا اور آخری عِشق پُنوں یار اور رانجھے دِلدار کو بھی شرماتا ہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اِس عِشق کو قاضی جی نے اپنے فطری اور رومانی انداز سے نکھارا۔ اِس اچھوتے عشق کی ابتدا ایک فلم دیکھنے کے ساتھ شروع ہوئی۔ فرماتے ہیں:

''فلم کا آخری شو دیکھ کر جب ہم اپنے بستر پر آرام فرمانے لگے تو نیند کے فرشتوں نے ہمیں اپنے دربار میں طلب فرمایا اور ہم پر خواب سحری نازل فرمائی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہم عمرِ خیام بنے رُباعیات کی تخلیق میں گم ہیں۔ اور بیوٹی کوئن سنگیتا ساقی بنی سوم رس کے مدھر جام پلا رہی ہے۔''

دوستوں سے خواب کی تعبیر پوچھی تو سب کی متفقہ رائے تھی کہ سنگیتا رنگیلے، البیلے قاضی جی کی زندگی میں سنگیت بھر سکتی ہے اور گا سکتی ہے کہ ''سات سُروں کا بہتا دریا تیرے نام'' بشرطیکہ اُن کا جادُو سر چڑھ کر بولے۔'' بس پھر کیا تھا، اُسی روز قاضی جی نے ظہیر الدین بابر کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے شراب کا بلوری پیالہ توڑ دیا۔ مُرغ تندوری پھینک دیا۔ کباب کی پلیٹ توڑ ڈالی اور گھر جا کر گوشت کی ہانڈی پھوڑ ڈالی اور پھر اپنے سر پر بچے چند بالوں کی قسم کھا کر یہ عہد کیا کہ جب تک وہ اپنے کالے جادو کی کالکھ کا سُرمہ سنگیتا کی آنکھوں میں نہ ڈال لیں گے تب تک وہ شراب، کباب اور شباب مع پیاز، لہسن اور مچھلی انڈہ کا سختی سے پرہیز کریں گے اور کرشن کنہیا بن کر خالص دودھ، دہی، مکھن اور سبزیوں کا پریوگ کریں گے۔ ہم دوستوں نے اُن کے فولادی عزم کی شان میں گلہائے عقیدت پیش کیے اور اُن کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگتے ہوئے اُن سے رُخصت ہوئے۔ چند روز بعد جب ہم اُن سے ملنے اُن کے طلسم کدہ پر گئے تو اُن کی امّاں مسکین بیگم سے معلوم ہوا کہ حضور اپنے طلسماتی کمرے میں بند ہیں اور حکم ہے کہ کمرے کے اندر کوئی داخل نہ ہو۔ ہم اپنا سا مُنہ لے کر واپس محفلِ یاراں میں حاضر ہوئے اور قاضی جی کی قیدِ تنہائی کے بارے میں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جانکاری بہم پہنچائی۔ یارانِ غم خوار نے تشویش کا اظہار کیا اور ناچیز کو ہدایت کی کہ ہم سارے معاملات کی تفصیل پیش کرتے رہیں۔ کچھ دِنوں بعد جب ہم دوبارہ قاضی جی کے آشیانہ گم گشتہ میں داخل ہوئے تو آپ کو اپنی امی جان کے پہلو میں بیٹھے ڈِنر کھاتے دیکھا۔ دال اُبلی، کدو کی یخنی تڑکے کے بغیر اور چپاتی خُشک۔ بڑا ترس آیا اپنے یار کی لاچاری پر۔ ہم نے پوچھا ''میاں! یہ کیا ماجرا ہے؟'' تو اشارے سے ہم کو خاموش کیا اور جیب میں سے کاغذ اور پین نکال کر کچھ لکھنے لگے۔ اِس بیچ ہم کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ پورا کمرہ لُوبان کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ایک بندر کی کھوپڑی اور گدھے کی پنڈلیوں کی ہڈیاں ایک طاقچہ پر دِکھائی دیں۔ مصلّے بچھا ہوا۔ دیواروں پر خوفناک تصویروں کے پوسٹر آویزاں اور چھوٹے میز پر پھٹی پُرانی کتابوں کے ڈھیر۔ قاضی جی نے کاغذ ہمیں دیا اور خود طلسماتی کمرے میں داخل ہو کر اندر سے چٹخنی لگا دی۔ کاغذ پر لکھا تھا:

''مَیں سنگیتا بیگم کو حاصل کرنے کے لیے چالیس روز کا چلّہ کاٹ رہا ہوں۔ ٹھیک اکتالیسویں دِن سنگیتا اُڑن کھٹولے پر سوار ہو کر قاضی منزل میں اُترے گی۔ اور ہمارے دِل کی دھڑکن بن جائے گی۔ لہٰذا بولنا چالنا، ملنا جُلنا، ابلیسی ہدایت کے مطابق سخت منع ہے۔ چلّہ مکمل ہونے تک کوئی دوست مجھ سے ملنے کی زحمت گوارا نہ کرے ورنہ بھسم ہو جائے گا۔'' ہم ڈرے سہمے دوستوں کی چوپال یعنی کافی ہاوس پہنچے اور قاضی جی کی تحریرِ آتشگیر اُن کے سامنے رکھ دی۔ سب نے قاضی جی کے صدق و محبت کی داد دی۔ مقررہ دِن ہم اُن کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے تا کہ اُڑن کھٹولے کو آنگن میں اُترتے دیکھیں۔۔۔ سنگیتا سمیت۔ بالکل اُس ہیلی کاپٹر کی طرح جو اکثر اُترتا ہے، چیف منسٹر کی کوٹھی میں۔۔۔ چیف منسٹر سمیت، لیکن:

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا۔

جوں ہی قاضی جی اپنے طلسماتی کمرے سے نمودار ہوئے۔ مُوا دُور درشن سنگیتا کے درشن کرا رہا تھا۔ وہ ایک کالے کلوٹے کرکٹر کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈالے وان کھیڑے سٹیڈیم کے ڈریسنگ روم میں بیٹھی تھی اور وہ کمینہ بلّے باز سب کی نظریں بچا کر سنگیتا کی بلّے بلّے کر رہا تھا۔ قاضی جی سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ اُنہوں نے گھر میں ایک کُہرام مچا دیا۔ اُنہوں نے دلیپ کماری انداز میں فلم دیدار کی طرح اپنی آنکھیں پھوڑنے کی کوشش کی لیکن ہم نے چھُری اُن کے ہاتھ سے چھین لی۔ پھر وہ کلر ٹیلی ویژن کی طرف لپکے ہی تھے کہ ہم نے اُن کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا کہ کہیں ٹیلی ویژن کی شامت نہ آجائے۔ بیچاری مسکین بی بی بیٹے کی حرکتوں پر لعنتیں بھیج رہی تھی اور اضافے کے طور پر بیچ بیچ میں ایک آدھ ہاتھ بھی جما رہی تھی۔ ہم نے بڑی مُشکل سے اُن کو قابو میں کیا۔ اُنھیں باہر لے گئے۔ اُن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی حلالی کمائی سے کولڈ کافی پلائی اور وہ یوں شانت ہوئے۔ دوسرے دِن یاروں کی محفل میں بیٹھ کر کہنے لگے:

''یار چلّے میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے ورنہ یہ ناممکن تھا کہ سنگیتا ڈارلنگ ہمارے بجائے کسی اور کی بانہوں میں ہوتی۔ خیر! ہم بلند حوصلہ اِنسان ہیں۔ ابھی ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ سنگیتا ہماری ہے اور ہماری رہے گی۔ ہم دوسرا چلّہ کریں گے یہ چلّہ پہلے سے بہت سخت ہوگا۔ یہ بیس روز کا ہوگا اور اِس میں جادو کے نایاب اور کامیاب نُسخے آزمائے جائیں گے۔ پھر دیکھنا، سنگیتا بیگم ہماری زندگی کا مدھر سنگیت بن جائے گی، لیکن دوستو! اِس پُر اسرار چلّہ کے لیے ہم آپ کا تعاون چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں کہیں سے اُلّو لا کر دیں کہ اُلّو کے خون میں تازہ جلے مُردے کی راکھ ملا کر اُس پر

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کالے جادو کا منتر پھونکنے سے بڑی سے بڑی پتھر دِل حسینہ بس میں آجاتی ہے۔ لہٰذا اُلّو کے ساتھ ساتھ تازہ جلے مُردے کی راکھ بھی لا دیجیے تو پھر آپ میرے کالے جادو کا کمال دیکھیں۔''

''اگر اُلّو نہ ملے تو؟'' ہم نے پوچھا۔

''تو پھر اُلّو کا پٹھا لے آئیں یعنی اُس کا بچہ۔''

تفریح وطبع کے لیے چند روز بعد ہم اُن کے یارِ غار نشاط باغ میں بکھری دِلکش کلیوں سے لُطف اندوز ہو رہے تھے کہ ناشپاتی کے ایک پیڑ پر اُلّو میاں کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ بچپن سے ماسٹر جی سے سُنا تھا۔ کہ اُلّو ایک حیادار مخلوق ہے اِس لیے دِن کے اُجالے میں کبھی آنکھیں نہیں کھولتا۔ اِس لیے ہم بلا خوف وخطر اُلّو کی جانب لپکے اور نہایت ہُنر مندی سے اُلّو جی کو پکڑ لیا اور قاضی جی کے حضور میں پیش کر دیا اور بولے:

''جناب بڑی مشکل سے شیتل ناگ مندر میں بیٹھے گوسائیں بابا کو پانچصد روپے نقد کہ نصف جس کے اڑھائی سو ہوتے ہیں، دے کر اِس اُلو میاں کو خریدا ہے لہٰذا رقم ادا کی جائے تا کہ دوستوں کا حساب کتاب صاف رہے۔ قاضی جی نے رقم ہمارے ہاتھ پر رکھتے ہوئے تازہ جلے مُردے کی راکھ کا تقاضا کیا۔ ہم سب شمشان گھاٹ کی طرف چل پڑے۔ چوکیدار کے ساتھ بیٹھ کر باقی دوست دُنیا کی بے ثباتی پر گُفتگو کرنے لگے اور ہم چوکیدار کی آنکھ بچا کر ایک جلتے مُردے کی گرما گرم راکھ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ قاضی جی نے مُردہ راکھ اور اُلّو میاں کو لیا اور اپنے جادُوئی کمرے میں چلے گئے اور ہم قاضی جی کے دوستوں کو ساتھ لے کر مغل دربار ہوٹل جا پہنچے اور کانتی اور کباب مزے لے لے کر کھائے۔

قاضی جی نے اپنا دوسرا چلّہ بڑے زور وشور سے شروع کیا اور جب آخری

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دِن ہم نے کُھل جا سِم سِم کہا تو قاضی جی اپنے سامری کمرے سے بڑے خوش وخرم باہر نکلے اور فرمانے لگے:

ہم نے کامیابی حاصل کر لی ہے۔ بالکل پرتھوی اور غوری کی طرح۔ کل ہم آپ سب کو ایک سرپرائز دیں گے یعنی آپ دیکھیں گے کہ ہماری محبوبہ سنگیتا بیگم ہماری بانہوں میں ہوں گی۔''

دوسرے روز ہم قاضی جی کے ڈرائینگ روم میں بیٹھے اُن کی محبوبہ کا انتظار کر رہے تھے اور وقت گزاری کے لیے سٹار ٹیلی ویژن سے نُصرت فتح علی خان مرحوم کو اپنی مشہور قوالی ''اکھیاں اُڈیکدیاں، دِل واجاں ماردا، آجا پردیسیا، واسطہ اُو پیار دا۔ آجا تینوں اکھیاں اُڈیکدیاں'' گاتے دیکھ رہے تھے کہ اناؤنسر نے قوالی روک کر یہ خبر تصویروں کے ساتھ نشر کی کہ آج شام مشہور فلم ایکٹریس اور ماڈل سنگیتا بجلانی کرکٹر اظہر الدین سے شادی کے بندھن میں بندھ گئے ہیں۔ بس پھر کچھ نہ پوچھیے کہ کیا ہوا۔ اِک قیامت برپا ہوگئی گھر پر جیسے ٹاسک فورس نے تلاشی کے لیے یلغار کر دی ہو۔ قاضی جی نے سارا سامان کھڑکی کے راستے باہر پھینک دیا۔ ماں کو دھکا دیا، ہمیں صلواتیں سُنائیں۔ کپڑے پھاڑ ڈالے اور اپنے گنجے سر کو پیٹ پیٹ کر لال کر دیا۔ ہم نے ڈھارس بندھائی اور کہا:

''قاضی جی! صبر کریں۔ ہوش میں آئیں۔ اگر آپ کے دُشمنوں کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا بنے گا۔ ہم تو زندہ درگور ہو جائیں گے۔ اِس لیے حوصلہ رکھیں۔ ہم اِس المناک واقع پر آپ کے ساتھ ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ اللہ آپ کو صبر جمیل عطا کرے اور سنگیتا کو اظہر کی پہلی بیوی کے علاوہ آپ کی بھی آہ لگے۔ اُس کے حُسن کو زوال آئے۔ وہ ایک پوری کرکٹ ٹیم کو جنم دے اور ہر بچہ اُس کو ایسے ایسے بونسر مارے کہ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اُس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جائے اور ہمیشہ کھانس کھانس کر اظہر کو گانا سُناتی رہے۔ 'من لاگو میرو یار رنجوری مَیں'۔ اُس کا رنگ اُتر جائے اور اُسے اور تو اور خود اظہر بھی نہ پہچان پائے۔'' ہم ڈھارس بندھاتے رہے۔ قاضی جی کے منہہ سے جھاگ نکلتی رہی، اور سٹار ٹیلی ویژن سے نُصرت فتح علی خان مرحوم کی قوالی چلتی رہی:

ے ایس توں ڈاڈا دُکھ نہ کوئی پیار نہ وِچھڑے
کِسے دا یار نہ وِچھڑے، کِسے دا یار نہ وِچھڑے

(فکاہیہ)

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

..... 1991ء کے بعد خالد حسین کے اُردو افسانوں کا نیا مجموعہ ''ستی سر کا سورج'' اب شائع ہو رہا ہے۔ بائیس افسانوں کا یہ مجموعہ خالد حسین کے فنِ افسانہ نگاری کی توسیع ہے۔ اِن کے لسانی، فکری اور افسانوی نظام کے اِنفراد و امتیاز کو مزید دھار اور رمق بخشنے والے اِن افسانوں میں خالد حسین نے خصوصیت کے ساتھ اپنی زمین ستی سر (جموں و کشمیر) پر چھائی ہوئی نفرت، وہشت، کٹر پن، تنگ نظری اور مکر و فریب کی تاریکیوں کی مختلف زاویوں سے تصویر کشی ہی نہیں کی ہے بلکہ ایک نئے سورج کے طلوع ہونے کا خواب بھی دیکھا ہے۔ تاکہ ستی سر میں پھیلی ہوئی تاریکی کا خاتمہ ہو سکے اور اِس زمین کے باسیوں کو عذاب کے دِنوں اور وحشت کی راتوں سے نجات مل سکے۔

پروفیسر قدّوس جاوید (ڈاکٹر)
سابقہ صدر، شُعبہ اُردو، کشمیر یونیورسٹی

.....خالد حسین اپنی کہانیوں کا مواد زمین کی کُھردری سطح اور اِرد گِرد کے ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کے اُس کی کہانیوں میں جہاں حُسن و جمال اور پیار محبت کی نزاکتیں ملتی ہیں، وہیں موجودہ پُر آشوب دَور کی تصویریں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ تصویریں ضرور بدصورت ہیں لیکن خالد حسین اِس بدصورتی کو خوبصورتی میں تبدیل کرنے کا خواہاں ہے۔ وہ اِن تصویروں کے ذریعہ امن اور سلامتی سے بھرپُور زندگی کا احساس دِلانا چاہتا ہے اور ایک نئی فِضا قائم کرنا چاہتا ہے۔ میری نیک خواہشات اُس کے ساتھ ہیں۔

نور شاہ
(افسانہ نگار)
للّہ دید کالونی، راولپورہ، سری نگر

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri